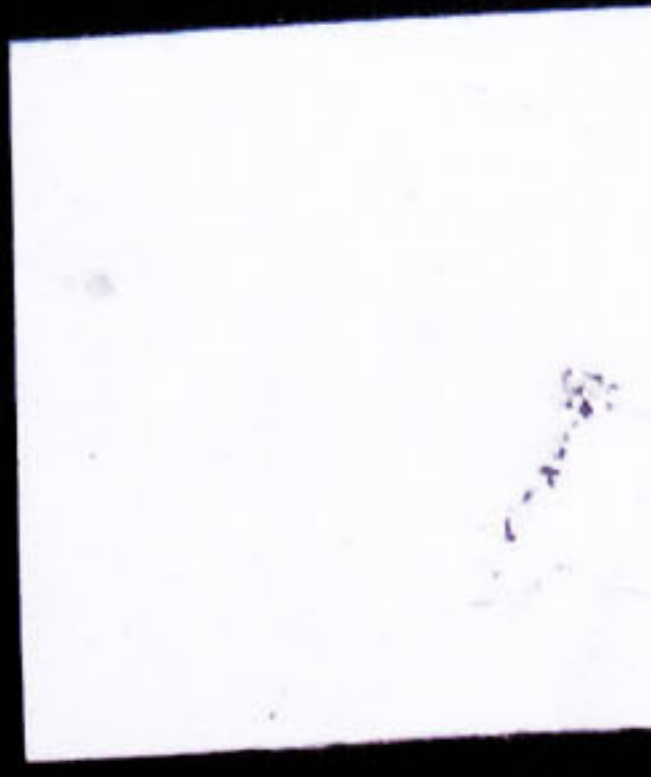


قال النبي صلى الله عليه وسلم

من أحب الله أحب الله

من أحب الله أحب الله



# غالب اور تصوف

سید محمد صدیق صاحب

ایجوٹیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

# GHACIB AUR TASAVVUF

By DATA ENTER

Syed Mohammad Mustafa Sabiri

Price Rs. 60/-

1990

ISBN 81 - 85360 - 58 - 8

۲۹۷۵۴

۳۱۵۹

۳۱۴۵۹

۱۹۹۰ء

۵۰۰

ساتھ روپے

قولو آفسیٹ پرنٹرس، بلیماران دہلی

سنہ اشاعت

تعداد

قیمت  
مطبوع

ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس

۳۱۰۸ گلی عزیز الدین ویل، کوچہ پنڈت لال کنواں دہلی

Phone : 526162  
774965

INDEX

# فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	تعارف	۲
۲	غالب اور تصوف	۱۵
۳	ایمان	۲۶
۴	تخلیق	۳۰
۵	تصوف	۳۶
۶	ظاہر و باطن	۴۳
۷	ذات محمدی حقیقت محمدی نور محمدی	۴۸
۸	تقدیر	۵۲
۹	فنا بقا ہمہ اوست ہمہ ازوست	۶۱
۱۰	عشق	۶۶

مکتبہ اسلامیہ

۱۴۳۱ھ

۷۳	عالم مثال	۱۱
۸۲	تنزیہ و تشبیہ	۱۲
۸۷	خیر و شر	۱۳
۹۰	قرب و معیت	۱۳
۹۳	محبت اور اخلاص	۱۵
۹۷	سماع	۱۶
۱۰۲	عبت	۱۷
۱۰۵	وحدت فی الکثرات	۱۸
۱۰۹	تصوف میں مختلف مراتب	۱۹
۱۱۲	دنیا کی بے ثباتی	۲۰
۱۱۷	توکل	۲۱
۱۲۱	انسان	۲۲
۱۲۵	استعداد اور تکلیف	۲۳
۱۲۹	گناہ	۲۴
۱۳۷	ایمان اور کفر	۲۵
۱۴۲	دعاء	۲۶
۱۴۷	عقل اور مذہب	۲۷
۱۵۲	محمد الرسول اللہ	۲۸
۱۵۹	حضرات صوفیاء کی اصطلاحات اور مسلمات	۲۹

# تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں  
غالب صریح نامہ نوائے سروش ہے

اس خاکدان میں اب تک اربوں انسان پیدا ہو چکے ہیں، خالق بعض افراد  
ایسے بھی پیدا کرتا ہے کہ جو دنیا میں اپنے ایسے کارنامے چھوڑ جاتے ہیں جو اوراق لیل  
و نہار پر نقش کا لہجہ ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے کجکلاموں کو دنیا نے بھلا دیا، مگر  
افلاطون، ارسطو، غزالی، زومی، سعدی، خاقانی، خسرو، حافظ، عرفی، بیدل، اور  
غالب نے فلسفہ، حکمت و شعر و ادب کے جو انمول موتی دنیا میں چھوڑے ہیں، ان  
کو اہل علم آج قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب ان ہستیوں  
میں سے ہیں جن کے اشعار کی قدر ان کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ مولانا الطاف حسین  
حالی نے بالکل صحیح فرمایا ہے :-

✓ ” لٹریچر کی قابلیت کے لحاظ سے مرزا (غالب) جیسا جامع جہتات آدمی خسرو  
اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا۔“  
(یادگار غالب)

غالب کے کلام میں فلسفہ، حکمت، تصوف، سوز و ساز، دل نشینی، دور  
 فکر، بلندی، فصاحت، بلاغت، گہرائی، گیرائی، ندرت بیان، آفریدگار  
 کے وجود کی شدت احساس، خالق کی وہی عنایتوں اور سیکراں بخششوں کے  
 کاسلیقہ، منعم کی فیاضی پر اعتماد، سب کچھ ملے گا۔ غالب کی شخصیت ہمہ گیر تھی،  
 شاعروں کی محفل میں مسندِ صدارت پر نظر آتے ہیں، صوفیوں کی صحبت میں شاہد  
 و مشہود کے راز بیان کرتے ہیں، مذہب کے حقائق اشعار میں پیش کرنے کا  
 اُن کو بڑا ملکہ ہے، غالب قدیم شعراء کی دوش پر نہیں چلے، اُن کو اپنی سخندانی  
 پر فخر تھا، چنانچہ ایک مرتبہ بے ساختہ کہا:

بر آورید گرا این جا بود سخندانے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد  
 (اگر کوئی اس شہر میں سخن دہے تو اس کو میرے سامنے لاؤ کیونکہ مجھے بھی  
 کچھ کہنا ہے)

غالب کو صرف اپنی شاعری پر ہی نہیں، علم پر بھی ناز تھا۔  
 سانہ بودیم بریں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد فن ما  
 (یعنی میں شاعر بننے پر راضی نہ تھا بلکہ فن شاعری نے خود مجھ سے استعجاب کی  
 کہ مجھے اپنا فن بنا لیجئے)

کسی قدیم شاعر کے قدم پر اگر قدم پڑ گیا تو فرماتے تھے کہ میرے شعر میں تو ارد  
 نہیں ہوا بلکہ اُس قدیم شاعر نے ازل میں میری ہی متاع چرائی تھی۔  
 مبرگمان تو ارد، بہ شعر من کہ دزد متاع من زہاں خانہ ازل بردست  
 کہا جاتا ہے کہ غالب زمانہ کی ناقدری سے تنگ آکر قنوطیت پسند  
 (PESSIMIST) بن گئے تھے۔ بونے گل سے اُن کا ناک میں دم آیا، سوز نہا

سے دل جلا، آہ آتشیں سے بال عنقا کو آگ لگائی، بیداد کاوشہائے مژگاں سے  
 کلچہ چھلنی ہوا، داغ ہائے تمنائے نشاط برداشت کئے، ساری عمر قید حیات کو بند  
 ہی سمجھتے رہے، ابنائے زمانہ نے اتنا ستایا کہ ان کو آسمان بھی جام واژگون نظر آیا  
 شراب میں خست اس لئے نہیں کی کہ ساقی گوثر کے باب میں ان کو سونے ظن نہ تھا،  
 یہاں تک کہ مشاہدہ حق کی گفتگو کرتے ہوئے بھی بادۂ وساغر کہے بغیر نہ بنی۔

اس سلسلہ میں دل چپ بات یہ ہے کہ عمر خیام، حافظ اور غالب وغیرہ  
 مئے معرفت سے مرشار میں مگر تینوں بادہ نوشی میں اس قدر مشہور ہوئے کہ عام لوگ  
 ان کو صوفی نہیں بلکہ مبخواری سمجھتے ہیں، خیام اور ان کے ساقی کی تصویریں سارے عالمی  
 ممالک میں ہر بڑی دکان پر نظر آئیں گی۔ ہم اس کتاب میں غالب کے دامن سے  
 مئے نوشی کا دھبہ تو نہیں مٹا سکے مگر یہ ثابت کر سکے ہیں کہ وہ مئے معرفت سے اسی  
 طرح مرشار تھے جس طرح عمر خیام اور حافظ تھے۔ مرزا غالب کو تصوف سے کس قدر حصہ  
 ملا تھا وہ عنقریب ہمارے قارئین کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کے بعض اشعار کو صرف اس  
 لئے مہمل قرار دیا کہ ان میں تصوف کو ”گوندھ“ دیا گیا ہے۔ مثلاً ان کے اس شعر  
 کو بعض شارحین نے مہمل قرار دیا، یا اس کا مطلب ایسا بیان کیا کہ جو ”بطن شاعر“ میں  
 نہیں تھا۔ یہ ان کے اردو کے دیوان کا پہلا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تخریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر سیکر تصویر کا  
 مرزا غالب، بہادر شاہ ظفر کے اتباع میں دہلی کے ایک بزرگ کالے صاحب  
 رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے۔ ایک کامل شخص کے پاس بیٹھ کر کوئی محرم نہیں رکھتا  
 مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

”مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلوی کے خاندان میں بیعت تھی“



مولانا حالی نے کئی جگہ ذکر کیا ہے کہ مرزا صاحب، حضرت میاں کالے صاحب کے مکان میں رہے اور حضرت کے ذریعہ سے مرزا صاحب کی رسائی قلعہ معلیٰ تک ہوئی۔ مولانا حالی فرماتے ہیں ”علم تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”برائے شکر گفتن خوب است“ اس سے مرزا غالب کو خاص نسبت تھی۔

مولانا حالی نے ایک جگہ غالب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

”لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موجد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ، لَا هُوَ شَرِيٌّ لِي الْمَوْجُودِ إِلَّا اللَّهُ“  
(یادگار غالب صفحہ ۴۸)

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”آب حیات“ کے مسودہ میں مرزا غالب کے حالات زندگی اپنے ہاتھ سے قلم بند کئے تھے۔ یہ مسودہ ”صحیفہ“ کے غالب نمبر میں آغا محمد باقر آزاد کے نوٹ اور حواشی کے ساتھ پاکستان میں شائع ہوا تھا۔ اس مسودہ میں مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:-

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے مگر تحصیل علوم درس کے طالب علما نہ طور پر نہیں کی۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ امیر زادے کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے۔ وہ کسی طبع خدا داد لایا ہوگا جس نے اس کے خیالات کو ایسا انداز، اور الفاظ کو یہ تراش اور ترکیب میں یہ روش پیدا کی۔ جا بجا ان کا قول ہے اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ ”زبان فارسی سے مجھے

مناسبت ازلی ہے۔“

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

”میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی رگڑ ہے۔“

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :-

”مرزا (غالب) اپنی حالت کو عوام سے چھپاتے تھے، جیسا کہ صوفیاء کا

عام ضابطہ ہے۔“

مرزا غالب نے ایک خط اپنے زمانہ کے ایک بزرگ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا ہے۔ اس کا اقتباس مہم اصفحہ پر ملاحظہ کریں۔

ہم نے اس کتاب میں غالب کے صوفیانہ اشعار کی جو تشریح کی ہے اس کو غالب کا اصل رنگ سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اسی لئے ہم نے یہ اثنا سات درج کئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس شاعر کے اشعار کی تشریح ہے جو خود بھی بادۂ معرفت سے سرشار ہو چکا تھا۔

اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ غالب حضرت غمگین کو، جو خود بڑے پایہ کے شاعر تھے، پیرو مرشد کہتے ہیں۔ حضرت غمگین نے ایک مرتبہ اپنی رباعی مرزا کو بھیجی مرزا نے اس میں تافیہ کی غلطی بتلائی، اس پر حضرت غمگین ان کو لکھتے ہیں :-

”رباعی میں تافیہ کی غلطی ہو کا تب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ میری بدحواسی

اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جو کوئی نادان بھی نہیں

کرنے کا حالانکہ بیس دفتہ میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب

کی طرف خیال ہی نہیں گیا، اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی

دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی۔ اسی سبب سے میں نے

بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فن سخن وری میں بیکتا  
 زمانہ کیا ہے لہذا آپ میرے دیوان کو اول سے آخر تک اصلاح کی نظر  
 سے دیکھ لیں آپ تاہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے محبت رکھتے  
 ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کر لیں۔ یہاں میرے ہم نشینوں میں  
 کسی کو اتنی جرأت نہیں کہ میری اغلاط پر مجھے مطلع کریں..... آپ کو  
 علم تصوف میں جو دستگاہ ہے، جس کا اظہار آپ کے خطوط سے ہوا  
 وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے۔ آئندہ سے مسائل تصوف کو ملاقات  
 پر موقوف رکھیے، مجھے آپ کا آزاد رویہ بہت پسند ہے، اسی لئے  
 میں آپ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں، اگر ایسا شاہباز ہاتھ آجائے  
 تو پھر سوائے سخفا کے تکرار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا..... میں  
 آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں، خدا تعالیٰ آپ کی بزرگی میں ترقی  
 دے، جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو میں بھی اسی کی تائید کروں گا۔ یہ

طریقہ میرا پسندیدہ ہے۔

ازدروں شور آشا و وزیروں بیگانہ نش  
 این چنین زیبا روش، کم می بود اندر جہاں

(کوہستان "غالب نمبر" ۶ فروری ۱۹۶۹ء)

غالب کی قابلیت اور اہلیت کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ ایک دلی کامل  
 جس کو وہ مرشد کہتے ہیں، نہ صرف ان کے مسلک کی تعریف کرے بلکہ ان سے اپنے  
 دیوان کی اصلاح کے لئے استدعا کرے۔" سچ ہے۔

ایں سوادت بزور بازو نیست، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ  
 سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے تصوف کے مسائل بیان کرنے کے لئے غالب کا

ہمارا کیوں لیا؟۔ اول تو تصوف انتہائی حقیقت ہے اور ہم اس حقیقت کو غالب کے الفاظ میں جدت پسند اور فلسفیانہ دماغ والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آج کل ہر تعلیم یافتہ ہر چیز کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، غالب خود حقیقت شناس اور حقیقت میں ہیں۔ ہم اگر صرف تصوف پر کوئی کتاب لکھتے تو نئی روشنی کے نوجوان اس قدر اعتقاد کرتے۔ یہ سہلہ امر ہے کہ نہ صرف ہندستان، بلکہ بیرونی ممالک میں غالب اور اقبال کے کلام کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب اور اقبال ہر جگہ مقبول ہیں اور ہر جگہ ان کے کلام کو اہام تصور کیا جاتا ہے۔

تصوف اس قدر حقیقت ہے کہ امام غزالی نے اس پر کئی کتابیں لکھی ہیں بلکہ ان کا قول یہ ہے کہ جو شخص تصوف نہیں جانتا وہ نبوت کی حقیقت بھی نہیں جانتا

”مَنْ قَدَّ مِنَ الضَّلَالِ“ میں اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”وَبِالْحَمْلَةِ فَمَنْ لَمْ يَرُقْ مِنْهُ شَيْئًا بِالذَّوْقِ

فَلَيْسَ يَدْرِكُ مِنْ حَقِيقَةِ النَّبُوَّةِ إِلَّا الْأَسْمَ“

(یعنی مختصر یہ ہے کہ جس نے تصوف کا کچھ مزہ نہیں چکھا ہے وہ نبوت کی کچھ

حقیقت نہیں جان سکتا بجز اس کے کہ نبوت کا نام جان لے۔)

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

”صوفیوں کے طریقے کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت اور اس

کا خاصہ بدیہی طور پر معلوم ہو گیا“ (الغزالی صفحہ ۱۳۶)

امام غزالی نے مزید فرمایا ہے :

”اس قدر ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ صفات انسانی تمام آدمیوں میں

یکساں پیدا نہیں کی گئی ہیں، ذہن و ذکاوت، فہم و فراست، عقل و  
 ذہانت، مختلف افراد صفات انسانی میں کس قدر مختلف المراتب میں  
 ایک شخص ذہین ہے، دوسرا شخص اُس سے زیادہ ذہین ہے، تیسرا  
 اُس سے بھی زیادہ ذہین ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچتی  
 ہے کہ ایک شخص سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر قدرت انسانی  
 کی حد سے باہر نظر آتے ہیں، جو لوگ شاعری میں، قوت تقریر میں  
 صناعتی میں، ایجاد میں تمام زمانے سے ممتاز گزرے ہیں وہ اسی درجہ  
 کی مثالیں ہیں۔ یہ درجہ فطری ہوتا ہے یعنی پڑھنے لکھنے سے حاصل نہیں  
 ہوتا بلکہ ابتدا ہی سے ان لوگوں میں یہ قوت مرکوز ہوتی ہے اور اسی  
 وجہ سے دوسرے اشخاص کو کتنی ہی محنت و کوشش کریں ان کے  
 ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ (الغزالی صفحہ ۱۳۷)

ابھی آپ نے پڑھا ہے کہ مرزا غالب فطری طور پر ذہین تھے، رسمی طور پر کسی  
 مدرسہ میں بھی نہیں پڑھا۔ کتاب کے شروع میں ہی آپ پڑھیں گے کہ صوفیاء کے  
 نزدیک ہر شخص کا ایک عین ہوتا ہے اس کو عین ثابتہ کہتے ہیں۔ ہر شخص کا عین  
 خالق کے علم میں ازل سے ہوتا ہے۔ کوئی منتفیس اپنے عین کے خلاف عمل نہیں  
 کر سکتا۔ اگر کوئی فطرناذہین ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ازل سے ہی اُس پر  
 حق کی عنایت ہے۔ غالب اس راز سے واقف تھے اسی لئے انھوں نے مخزکیا  
 ہے اور کسی کی ستائش اور مذمت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

غالب کے صوفیانہ اشاری الحقیقت گنجینہ بمعنی کاظم ہیں۔ ان کے  
 زمانے میں ان ہی اشار کو دیکھ کر ان کو بے معنی قرار دیا گیا۔ آخر تنگ آکر

ان کو کہنا پڑا ہے

ازرد و ہم قبول تو فارغ نشسته ایم اے آنکہ خوب مائتہ شناسی ز زشت ما  
(آپ کے رد اور قبول کی مجھے پرواہ نہیں کیونکہ آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ  
میرا اچھا شعر کونسا ہے اور بُرا شعر کونسا ہے ۛ)

غالب کی یہ پیشینگوئی تو توفیق صدی صحیح ثابت ہوئی

ع : شہرتِ شرم نہ گیتی، بعد من خواہد شدن

(دنیا میں میرے اشعار کی شہرت میرے مرنے کے بعد ہوگی)۔

جیسا کہ ثابت ہو گیا ہے، غالب صوفی منش تھے، توحید و جود ہی کے نشہ سے

سرشار تھے، اسی لئے اشعار دقیق ہونے کے باوجود ان میں سوز اور اثر ہے، خالق  
کا شکر ادا کرنے کے بہت اشعار ملیں گے جن کی شعراء کے دیوانوں میں کمی نہیں۔

مگر غالب کے اس شعر کا جواب نہ ملے گا

جان دی، دی ہرئی اُسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اللہ کے سامنے جان حاضر کر دینا بڑا کام ہے خالق خود بھی اس کو بڑی چیز

سمجھتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں اسی لئے اس کا درجہ بھی ان کی بارگاہ عالیہ میں بڑا

ہے۔ مگر غالب کے نزدیک خالق کی بخشی ہوئی جان کو ان کے ہی سامنے پیش

کر دینا کوئی بڑا کام نہیں۔ ان کی چیز تھی اُن کی امانت تھی اُن ہی کو واپس کی ہے

لہذا کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ یہ تصور انہوں نے سوئی سے لیا ہے

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمیں کئی منت شناس ازو کہ بخدمت گذارِ شنت

(یعنی تو احسان مت رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ اُس کا ہی احسان

سمجھ کہ تجھ کو خدمت پر لگا رکھا ہے ۛ)

اس موقع پر یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ہم قارئین کو غالب کے صوفیانہ خیالات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں شعر کی لطافت اور معنی آفرینی پر غالب کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، مجازی عشق کے متعلق بڑے نفیس اشعار ان کے خزانے میں موجود ہیں مگر ایسے اشعار کو ہم نے ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ اس کتاب میں جو روش اختیار کی گئی ہے ایسا کرنا اس کے خلاف تھا۔

غالب کے صوفیانہ اشعار کی تشریح میں صرف اس شعر کے مطلب پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ اس کو لکھ کر تفصیل کر دی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کی معلومات میں اضافہ ہو، مثلاً اس شعر کی تشریح میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے کہ

قطرہ میں وجہ دکھائی نہ سے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

اس شعر میں شریعت، طریقت، حقیقت، عقل و نقل سب کچھ ہے اسی لئے اس میں شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے۔

غالب کے اس نعتیہ شعر کی تشریح میں ہم اختصار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس سے قارئین کو تسلی نہیں ہو سکتی تھی، ہر شخص محبوب کا ذکر تفصیل سے سُننا چاہتا ہے لہذا ہم نے رسول پاک کی سوانح عمری ہی مختصر طور پر بیان کر دی ہے۔

شعریہ ہے سے

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزائیم کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

تقدیر کا موضوع ایسا ہے جس کو ہر شخص تفصیل کے ساتھ جانتا چاہتا ہے، لہذا اس مسئلہ پر ہم نے معتدل بحث کی ہے تاکہ اس کا کوئی پہلو اوچھل نہ رہ جائے اور قاری کو اطمینان ہو جائے اور سارے شبہات دور ہو جائیں، نگاہ حقیقت تک پہنچ جائے۔

ظاہر و باطن کے زیر عنوان تنزیلاتِ ستہ پر مختصر بحث کی گئی ہے، یہ صوفیاء کا ایک مہتمم بالشان مسئلہ ہے، یہ عوام کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا مگر غالب کے اس شعر کی تشریح میں

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پر وہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھانے بنے  
تنزیلاتِ ستہ کا ذکر کئے بغیر چارہ کار نہ تھا مگر اس کی تفصیل دانستہ نہیں  
کی گئی کیونکہ اس سے قارئین کو خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجمل ذکر کافی تھا  
سرسری نظر میں یہ مقامات قارئین کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے اس لئے ہم نے اس  
کے ساتھ نقشہ بھی دیدیا ہے۔ احدیت، وحدیت، واحدیت، روح، مثال،  
جسم، انسان، ان کے مراتب نقشہ کو غور سے دیکھنے سے سمجھ میں آجائیں گے۔  
ذات محمدی، حقیقت محمدی، نور محمدی کی وضاحت اس لئے الگ کی  
گئی ہے کہ اکثر لوگ ذات محمدی، اور نور محمدی کو ایک ہی حقیقت سمجھتے ہیں، مگر  
ذات محمدی اور حقیقت محمدی دو الگ الگ حقائق ہیں ان کو ایک ہی حقیقت  
سمجھنا الحاد ہے، کفر ہے، جہالت ہے۔

اس کتاب کے آخر میں حضرات صوفیاء کی مشہور اصطلاحات کی مختصر  
وضاحت کر دی گئی ہے جس کی افادیت میں شبہ نہیں۔ ان اصطلاحات کو حافظ  
جامی، عمر خیام اور دیگر صوفیاء نے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب کو تصنیف کرنے کا بڑا مقصد یہی تھا کہ لوگ تصوف کی حقیقت  
کو سمجھیں، صرف نام جاننے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ہم نے تصوف کے نکات کی وضاحت کرتے ہوئے جن جلیل القدر کتابوں  
سے مدد لی ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں :- قرآن عظیم، بخاری و مسلم،



فتوحاتِ مکیہ، فتوحاتِ محکم (شیخ محی الدین ابن العربی یعنی شیخ اکبر) مکتوبات  
 حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ - حجتہ اللہ البالغہ، ہمعات (شاہ  
 ولی اللہ)، تفسیر فتح العزیز (شاہ عبدالعزیز) احياء العلوم الدین، کیمیائے  
 سعادت (امام غزالیؒ)، مثنوی مولانا جلال الدین رومیؒ، سیرت النبیؐ،  
 الغزالیؒ (علامہ شبلیؒ)، عمراط مستقیم (مولانا اسمعیل شہیدؒ) ارشاد الطالبین  
 (قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ) ریاض المتراض (نواب صدیق حسن خاں) قرآن  
 اور تصوف، رموز عشق (ڈاکٹر میجر ولی الدین)۔

تصوف کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے ہم نے کوشش کی ہے کہ  
 اس کتاب کی کوئی سطر بھی دین حق اور صوفیائے کرام کے مسلک کے خلاف نہ ہو  
 اور جن مسائل کے متعلق عوام میں غلط فہمی پائی جاتی ہے ان کی دل نشیں وضاحت  
 کر دی جائے مثلاً تقدیر، فنا، بقا، خیر و شر، ایمان و کفر، گناہ، نور محمدی  
 وغیرہ۔ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھنے کے بعد ان شاء اللہ  
 تعالیٰ اطمینانِ قلب حاصل ہوگا، ذکر و فکر میں لطف آئے گا، شکوک و  
 شبہات ختم ہو جائیں گے، شرح صدر ہوگا، حق الیقین کا احساس ہوگا۔  
 میں یہ بھی واضح کر دوں کہ اس کتاب کی اشاعت میرے بس سے  
 باہر تھی خصوصاً اس گرانی کے زمانے میں۔ مگر رب تقدیر نے دستگیری کی،  
 عزیز مصطفیٰ کمال نے مجھ کو ہمت دلائی، حوصلہ بڑھایا اور اس کتاب کے  
 چھپوانے میں بہت دوش دھوپ کی۔ ہمارے دوست مولوی ظہیر احمد نے جو  
 خود بھی علم و دست ہیں اس کی کتابت بہت ذوق و شوق سے کی، خداوند کرم  
 ہماری کوششوں کو مشکور فرمائے اور ذخیرہ آخرت بنائے۔ میں آخر میں

اپنے استاذ فاضل اجل، عالم باعمل حضرت مولانا نور الحسن صہابریؒ  
 رام پوری خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے لئے حق سبحانہ  
 سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے کہ جن کی  
 شاگردی، کرامت اور فیضانِ نظر سے میں یہ کتاب لکھنے کے قابل ہوا ہے  
 آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند  
 آیا بود کہ گوشہ چشمتے بہ ما کنند

۹

سید محمد مصطفیٰ صہابری

قصبہ رامپور ضلع بہار پور یوپی

# غالب اور تصوف

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن  
ہم کو تقلید تنگ طر فی منصور نہیں

بے شبہ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ صوفی اپنے آپ کو دریائے وحدت

کا ایک قطرہ سمجھتا ہے۔ اس حالت کو "سکر" کہتے ہیں۔ یہ اولیاء کا مرتبہ ہے۔ یہ

"مقام فنا" کہلاتا ہے۔ اس کے بعد "بقا" کا مرتبہ ہے، یہ مقام انبیاء کا ہے۔

بعض مقررین کو بھی یہ مقام عطا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو ان مقامات پر  
سیر حاصل بحث ملے گی۔

اسیلم ہے کہ انسان کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں، جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے

ہیں وہ اس کو قنوطیت پسند اور گوشہ نشین بنا دیتے ہیں۔ چونکہ مصیبت میں

اکثر خدایا داتا ہے اس لئے عام دانشوروں نے اس سے یہ نتیجہ اتنباط کر لیا کہ

افلاس، آلام، مایوسیوں، محبوب اقرباؤ کی جدائی ہی انسان کو تصوف کی پناہ

میں لاتی ہیں۔

غالب کا یہ کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو بھی ایسا شعر کہا ہے اس کی

تائید قرآن و روئے حدیث سے ہوتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے

✓ دہر جز جلوة بکتائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں

اس شعر کا صحیح مطلب اسی وقت بیان کیا جاسکتا ہے جبکہ کسی کے سامنے یہ حدیث

قدسی ہو۔ بلکہ غالب جس حد تک وسیع النظر تھے اس سے ہم کو یہ یقین ہے کہ انہوں

نے اسی حدیث کا خوبصورت اور دل نشین ترجمہ کر دیا ہے۔ حدیث یہ ہے :-

كُنْتُ كَثْرًا مَخْفِيًّا فَاحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ وَخَلَقْتُ الْخَلْقَ :-

✓ (میں ایک مخفی خزانہ تھا مجھے اس بات سے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں لہذا

میں نے مخلوق پیدا کر دی) ۱

✓ مستشرقین خصوصاً براؤن، نکلسن، اور ہندوستان و پاکستان کے بعض محققین

کا خیال ہے کہ اسلامی تصوف یا تو ایرانیوں سے لیا گیا ہے یا یونانیوں سے۔ بعض

نے کہا ہے کہ ہندو وازم سے لیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اس وقت عرب

ایک اُن پڑھ قوم تھے وہ اس قدر باریک باتیں سمجھ ہی نہیں سکتے تھے اس وقت

قرآن نے کہا "وَمَنْ أَقْرَبُ إِلَيَّ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ" (ہم اللہ) انسان

سے اس کی رگ گلو سے بھی قریب تر ہیں۔ بقول خسرو

دور از جانی و در جانی ہنوز

ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی نکات کی تشریح کے لئے غالب ہی کو کیوں

منتخب کیا گیا، جو خود باعمل نہ تھے، اس موقع پر اس کتاب میں گناہ کے موضوع

پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو غور سے دیکھنا چاہیے، بہر حال اس موقع پر اس

اعتراض کا جواب یہ ہے کہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں، زیادہ سے زیادہ

یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کم کہنگار ہے۔ پھر ایک مسلمہ اصول ہے خُذْ مَا صَفَا وَ

دَعُ مَا كَدَرُ (جو چیز اچھی ہو اس کو لے لو باقی ناقص کو چھوڑ دو) ہم نے غالب کے صرف ان اشعار کی تشریح کی ہے جن میں تصوف پایا جاتا ہے۔ غالب کے سارے اشعار صوفیانہ نہیں، ایسا دعویٰ تو مولانا رومیؒ کی مثنوی کے متعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں اکثر حکایتیں ہی ہیں۔ وحدت الوجود کے مسئلہ کے سوا اس مثنوی سے دیگر مسائل تصوف کا اخذ کرنا تو انتہائی مشکل ہے۔ غالب کے اشعار میں ذرا غور کرنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شعر سے تصوف کا کونسا مسئلہ نکلتا ہے یا فلسفہ کے کس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بعض حکمائے یونان کا خیال ہے کہ عالم حادث (فنا پذیر) ہے غالب بھی اس سے متاثر ہیں مگر دیکھئے کس خوبصورتی کے ساتھ ثابت کرتے ہیں یہ

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام

مہر گردوں ہے چراغ رہگذار بادیاں

یعنی ساری کائنات فنا پذیر ہے، یہاں تک کہ سورج بھی اس چراغ کی مانند ہے کہ جس کو اس راستہ پر رکھ دیا جائے جہاں سے ہوا گزرتی ہو اور اس کو ایک ہی جھونکے سے بچھا دے۔

دنیا میں لوگ خوب دل لگا کر رہتے ہیں مگر اس کی بساط کچھ نہیں، محض خیال ہے اس کو کس بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہ ہستی کے مت فریب میں آجا ہوا سد عالم تمام حلقہ دام و خیال ہے

ہ ہاں کھا تو مت فریب ہستی ہر چید کہیں کہ ہے "نہیں ہے

تصوف کے مختلف مسائل پر غالب کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔ تخلیق و ابداع

نقش فریاد ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اخلاق سے

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

خیر و شر سے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

تقدیر سے

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

خلوص سے

طاعت میں تاہے نہ مئے اگبیس کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ظاہر و باطن سے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھانے بنے

عالم مثال سے

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

تشریح و تشبیہ سے

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بوجھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

قرب و معیت سے

بر آورد بے کلفت و سمت و شو بہ نور السموات والارض روا

عقل و مذہب سے

قطرہ میں رطل دکھائی نہ دے اور جزو میں گل کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

استعداد اور تکلیف سے

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہم نے اس کتاب میں ان میں سے اکثر اشعار کی مکمل تشریح کی ہے، تشریح کے دوران غیر ارادی طور پر تصوف کے ایسے نکات کی توضیح بھی ہو گئی ہے جو عوام کی نظر سے اوجھل تھے یا اگر تصوف کی بعض کتابوں میں ملتے ہیں تو اس قدر تشنہ رہ گئے ہیں یا اتنی مبغلق زبان میں ہیں کہ جن کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں عوام کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ ان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ارسطو نے جب فلسفہ کی تشریح کی تو اس کا استاد افلاطون ناراض ہوا اور کہا کہ تم نے فلسفہ جیسی بلند چیز کو عوام کے ہاتھوں میں دیدیا۔ ارسطو نے جواب دیا کہ اگرچہ میں نے فلسفہ کے مشکل مسائل کی تشریح کی ہے مگر اس قدر مشکل زبان میں کی ہے کہ خواص ہی سمجھ سکتے ہیں، عوام کچھ نہیں سمجھیں گے۔

شیخ محی الدین ابن العربی (شیخ اکبر) پہلے عالم اور صوفی ہیں جنہوں نے وحدت الوجود (ہمہ ادست) پر فن کی حیثیت سے کتابیں لکھی ہیں جن میں ”فصوص الحکم“ اور ”فتوحات مکیہ“ بہت مشہور ہیں۔ ان کتابوں کے دیباچہ میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ جو اس فن کو نہیں جانتا وہ میری ان کتابوں کو نہ پڑھے۔ علماء میں یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ بعض متاخرین کا علم، متقدمین سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی نظروں سے بہت سی کتابیں گزر چکی ہوتی ہیں جو متقدمین کے بعد لکھی گئی ہیں۔ غالب شعراء میں مفرد حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ تصوف کے سارے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس لئے ان کے قلم سے بے ارادہ ایسے اشعار نکل گئے ہیں جن میں خود ستائی اور تعالیٰ کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً

غالب قلمت پر وہ کٹائے دم عیسیٰ است      چوں بر روش طرز خداداد بہ جنب  
فیض حق است قبول سخن و شادی نستخ      بہ قلم نازم اگر تکیہ موسیٰ بہ عصاست

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا  
مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً کبھی صوفی تھے۔ مولانا محمد حسین  
آزاد لکھتے ہیں :-

”مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلوی کے خاندان میں بیعت تھی“

مولانا حالی نے ”یادگار غالب“ میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ :-

”مرزا صاحب، حضرت میاں کالے صاحب کے مکان میں رہے اور

حضرت کے ذریعہ سے مرزا صاحب کی رسائی قلعہ معلیٰ تک ہوئی“

مولانا حالی ”یادگار غالب“ میں لکھتے ہیں :-

”علم تصوف، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ ”برائے شر گفتن خوب است“

اس سے مرزا غالب کو خاص مناسبت تھی، حقائق و معارف کی کتابیں اور

رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھے تو

انہیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں، بلکہ

بارہویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا“

(یادگار غالب صفحہ ۵۲)

”انہوں نے تمام عبادات و فرائض اور واجبات سے صرف دو چیزیں

لی تھیں، ایک توحید و جود اور دوسری نبی اور اہل بیت نبی کی محبت“

(یادگار غالب صفحہ ۶۷)

ایک جگہ غالب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :-

”لیکن اس میں شک نہیں کہ میں مؤجد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور

سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں :-



”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ  
لَا مَوْشِرًا فِي الْوُجُودِ إِلَّا اللَّهُ“

(یادگار غالب صفحہ ۲۸-۲۹)

مرزا غالب نے ایک خط اپنے زمانے کے ایک بزرگ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ  
یہ خط طویل ہے ہم اس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ اس سے مرزا صاحب کا  
رُحمان طبع صاف معلوم ہوتا ہے۔ کچھ انکسار کے بعد لکھتے ہیں :-

”میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے بجزنگی کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی  
سی بخودی عنایت کر دی ہے، وجود کی تقسیم پر جیسا کہ اہل نظر کا اعتقاد  
ہے میں یقین نہیں رکھتا، کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں  
کر سکتا، نہ اس میں تغیر و تبدل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے  
مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، وجود اورستی کے سوا  
جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔  
ماہماں، عین خودیم، اما خود از وہم دو می  
در میان ما و غالب، ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن العربی کے  
ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ ”الْحَقُّ مَحْسُوسٌ وَالْخَلْقُ  
مَعْقُولٌ“ یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو  
کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں، کبیرا ایمان یہی ہے، باقی سب  
وہم ہے۔ اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم ولایت و نبوت، حشر و نشر، عذاب  
و ثواب سب درست ہے اور ان سب پر سیرا ایمان ہے۔ آپ کی توجہ باطنی

سے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا۔ اعیان ثابتہ نے وجود کی بڑھی نہیں سو گئی۔ (اس موقع پر مرزا غالب نے یہ شعر لکھے ہیں)۔

چو پردہ شب یار مصور بہ خیال است      این کارگردہم ز پیدائی اشیاء  
اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بہ دامن      اما ہمہ از نقش و نگار پر عنقا  
مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی دیا کیلئے  
لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے۔ لیکن مقصد صرف اپنے عقیدہ کا اظہار  
ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ہے سب کو ایک کیفیت  
کے ساتھ قبول کرتا ہے، کفر کو بھی اور اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی۔ یہ سب  
تصور کی حیثیت سے موجود ہیں، لیکن وہ تصور نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ وہ تصور جو  
اس کیفیت خاص کو حاصل ہے، خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل  
ترقی کر جائے تاکہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہو جاؤں اور رنگ اور  
بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہو جاؤں۔“

یہ سب مرزا غالب کے الفاظ ہیں۔ اہل نظر مذکورہ سطور کو پڑھ کر سمجھ سکتے  
ہیں کہ غالب کیا تھے، غالب بے شک صوفی تھے، غالب کو عام لوگ جو کچھ سمجھتے ہیں  
وہ ایسے نہیں تھے بلکہ اُس سے بلند و بالا تھے۔ ہم نے ان کے صوفیانہ اشعار کی جو تشریح  
کی ہے اس کو غالب کا اہل رنگ سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ اسی لئے ہم نے یہ اقتباسات  
درج کئے ہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس شاعر کے اشعار کی تشریح ہے جو

خود بھی بابۃ معرفت سے سرشار ہو چکا تھا۔

مصنف

۲۶/۱۱/۹۵

# ایمان

اب ہم حدیث جبریلؑ کی تشریح کرتے ہیں جس میں ایمان، اسلام، تصوف سب کچھ ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تصوف بھی اسلام کا ہی ایک جزو ہے۔“

حدیث جبریلؑ: تحفۃ الاخیار، ترجمہ مشارق الانوار کی فہرست میں یہ الفاظ ہیں

” حدیث جبریل درساں حقیقت اسلام و ایمان و احسان کہ عبارت از تصوف و درویشی است مذکور است۔“

اب ہم اس کا ترجمہ من و عن و تشریح درج کرتے ہیں۔

” بخاری و مسلم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ سوائے خدا کے کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور یہ کہ تو نماز پڑھے، زکوٰۃ دیوے اور رمضان کے روزے رکھے اور خانہ خدا کا حج کرے اگر تجھ کو اس راہ کی طاقت ہو یعنی بشرط خرچ اور سواری کے۔“ یہ حضرت نے جبریلؑ سے کہا جبکہ جبریلؑ حضرت کے پاس مرد کی صورت پر آئے تھے سوا انہوں نے (جبریلؑ) کہا ”آپ نے سچ کہا۔“ جبریلؑ نے کہا ”مجھ کو ایمان کی حقیقت بتلائیے۔“ حضرت نے فرمایا ”ایمان یہ ہے کہ تو دل سے مانے اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو،

اور اس کے پیغمبروں کو اور کھیلے دن کو یعنی قیامت کو اور تقدیر کو مانے بھلی یا  
 بُری، جبرئیلؑ نے کہا ”آپ نے سچ کہا“ جبرئیلؑ نے کہا، تو احسان (نصوف)  
 اور اخلاص کی حقیقت بتلائیے۔ حضرتؑ نے فرمایا ”أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ  
 تَرَاكَ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ۗ“ یعنی تو اللہ کی ایسی  
 عبادت کرے کہ جیسے کہ اُس کو دیکھ رہا ہے، سو اگر اس طرح کا دیکھنا تجھ سے نہ  
 ہو سکے تو یوں جان کہ وہی تجھ کو دیکھتا ہے۔ جبرئیلؑ نے کہا تو اب قیامت کا حال  
 فرمائیے کہ کب ہوگی؟ حضرتؑ نے فرمایا ”جواب دینے والا پوچھنے والے سے کچھ  
 زیادہ تر نہیں جانتا یعنی قیامت کی ناواقفی میں تم اور میں دونوں برابر ہیں!“  
 جبرئیلؑ نے کہا ”تو اس کے پتے ہی بتلائیے۔ حضرتؑ نے فرمایا قیامت کی نشانی  
 یہ ہے کہ لونڈی اپنے مالک اور مرتبی کو جنے، یعنی مالکوں کے نطفے سے لونڈیاں  
 جنیں تو ان کی اولاد بھی اپنے باپ کی طرح لونڈیوں کی مڑتی ٹھہری۔ خلاصہ مطلب  
 یہ ہے کہ قیامت کے قریب کنیزک زادوں کی کثرت ہوگی، اور دوسری نشانی قیامت  
 کی یہ ہے کہ تو دیکھے ننگے پاؤں، ننگے بدن، محتاج بکریاں چرانے والوں کو کہ بڑا یا  
 ماریں گے عمارت میں، یعنی کینے اور بے حقیقت لوگ دولت مند ہوں گے بڑی  
 بڑی عمارتیں بنا کر فخر کریں گے۔“

پوری روایت اس حدیث کی یوں ہے کہ عمر فاروقؓ نے کہا کہ ہم حضرتؑ کے  
 پاس بیٹھے تھے کہ ایک مرد نمودار ہوا نہایت سفید کپڑے اور بہت سیاہ بال  
 والا کہ اس پر کچھ سفر کا اثر نہ معلوم ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا  
 نہ تھا، سو چلا آیا یہاں تک کہ حضرتؑ کے پاس بیٹھا زانو کو حضرتؑ کے زانو کے  
 ساتھ ملا کر، اپنی دونوں ہتھیلیاں حضرتؑ کے زانو پر رکھیں اور کہا کہ اے

محمدؐ مجھ کو اسلام کی حقیقت بتلائیے، تب حضرتؓ نے یہ حدیث فرمائی۔  
 عمر فاروقؓ نے کہا کہ پھر وہ مرد چلا گیا اور میں دیر تک حیرت میں چپکا رہا۔ پھر حضرتؓ  
 نے فرمایا "اے عمرؓ تو جانتا ہے وہ کون تھا؟" میں نے کہا "خدا اور اس کا  
 رسول ہی زیادہ جانتا ہے، حضرتؓ نے فرمایا کہ یہ جبریلؑ تھا تمہارے پاس تم  
 کو دین سکھلانے کو آیا تھا۔"

اس حدیث کو حدیث جبریلؑ کہتے ہیں، اس واسطے کہ سائل حضرت  
 جبریلؑ تھے۔ اور اُم الاحادیث اور اُم الجوامع بھی اس کا نام ہے یعنی سب  
 حدیثوں کی جڑ ہے، اس واسطے کہ جو مطلب اور احادیث میں ہیں وہ سب اس  
 حدیث میں موجود ہیں۔ جیسے سورۃ فاتحہ کو اُم الکتاب کہتے ہیں کہ قرآن کرب  
 مطلب پر شامل ہے۔

حضرت جبریلؑ نے چار چیزیں حضرتؓ سے پوچھیں۔ اول اسلام کی حقیقت  
 دوسرے ایمان، تیسرے احسان، چوتھے قیامت۔  
 اسلام کی حقیقت پانچ ارکان ہیں۔ توحید، رسالت کی گواہی، نماز  
 زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج۔

معلوم ہوا کہ اسلام ظاہری عمل کا نام ہے اور ایمان تصدیق قلبی اور  
 اعتقادِ دلی کا۔ پھر حضرتؓ نے احسان (اخلاص یا تقویٰ) کے  
 دو درجے فرمائے، اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ عبادت میں ایسا حضور ہو کہ گویا خدا کو  
 دیکھتا ہے، اس کو شاہدہ کہتے ہیں۔ اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ یہ تصور کرے کہ خدا مجھ کو  
 دیکھتا ہے اس کو مراتبہ کہتے ہیں۔ اس تصور میں بھی کمال تعظیم اور نہایت  
 ادب اور حیا اور شوق اور حضوری حاصل ہوگی، ممکن نہیں کہ اس تصور میں آدمی ادب

چھوڑ دے یا ادھر ادھر انکساف کرے ، جیسے بادشاہ اگر کسی کو دیکھتا ہو تو کیا ممکن ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں ہلا دے یا نظر کو اٹھا دے۔ معلوم ہوا کہ تصوف اور درویشی احسان کا نام ہے۔ ظاہری اعمال کو اسلام کہتے ہیں اور باطنی اعتقاد کو ایمان کہتے ہیں۔ حضوری، اخلاص (تصوف) کو احسان کہتے ہیں۔ دین اور شریعت، اسلام ایمان اور احسان کے مجموعے کا نام ہے۔ اور گاہے اسلام اور ایمان کو ایک کہتے ہیں اس واسطے کہ اسلام بدون ایمان کے درست نہیں اور ایمان بدون اسلام کے کامل نہیں۔ اور بعض لوگ احکام ظاہری کو شریعت کہتے ہیں اور تصفیہ باطن کو طریقت اور شاہدے و مراقبہ کو حقیقت کہتے ہیں۔ معلوم کیا چاہیے کہ دین کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے، سو اس حدیث میں حضرت نے تینوں مقام کو بیان فرمایا ہے۔ اسلام اشارہ ہے فقہ کا جس میں اعتقاد کا بیان ہے اور احسان اشارہ ہے تصوف کا، جس میں حق آتقین اور شاہدہ اور مراقبہ مذکور ہے۔ معلوم ہوا کہ دین میں کامل وہی ہے جو فقہ اور کلام اور تصوف کا جامع ہو اور ان تینوں میں سے بعض ہو اور بعض نہ ہو وہ ناقص اور کچا ہے۔

(تحفۃ الاخبار ترجمہ مشارق الانوار صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰)

✓

# تخلیق!

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ سحریر کا  
کاغذی ہے پیراں ہر پیکرِ تصویر کا

یہ غالب کے اردو دیوان کا پہلا شعر ہے۔ بعض شارحین نے اس کو بے معنی قرار دیا ہے۔ اور اس پر تو سب ہی کا اتفاق ہے کہ یہ مشکل ترین شعر ہے۔ بعض نے یہ اعتراض کیا ہے کہ پیکرِ تصویر کے کاغذی پیراں ہونے کے کوئی معنی نہیں، اور کہیں بھی یہ رسم نہیں تھی کہ مستغیث کاغذ کا پیراں پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہو، مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ بعض جگہ ایسی رسم تھی۔ اس کا ثبوت کمال اسمعیل کا یہ شعر ہے۔

کاغذی جامہ پوشید، وہ درگاہ آمد

زادۂ خاطر من تا بدی داد سرا

اب ہم اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ دراصل غالب نے سعدی کے

اس شعر کو اپنے ذوقِ مشکل پسندی کے سبب اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

برگِ درختانِ بجز در نظر ہو شیار

ہر ورقے دفتریت معرفتِ کردگار

ذوق نے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے۔

ک عالم تمام چشم حقیقتِ نگر بنا

منہ دیکھتا ہے آئینہ، آئینہ ساز کا

✓ غالب کا یہ شعر ”گنجینہ معنی کا طلسم“ ہے۔ انھوں نے خالق اور مخلوق کے تعلق کو گہرائی اور گیرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بالفاظ دیگر تصوف کے دریا کو ایک کوزہ میں بند کیا ہے۔ اس شعر کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ ساری کائنات گویا ایک نقش ہے جو نقاش (خالق) کی صنّاعی کاشتوت زبانِ حال سے دے رہا ہے۔ نقش کیا ہے؟ اشیاء کی صورتیں! اشیاء کو اپنی صورتیں بنانے پر قبل تخلیق کوئی اختیار نہ تھا۔ تخلیق کیا ہے؟ قادر مطلق کی قدرت کا ظہور یا تمثیل یا تجلی۔ یہ وضاحت شیخ محی الدین ابن عربی نے کی ہے جن کا ذکر تعارف میں آچکا ہے۔ اور مرزا غالب وحدۃ الوجود میں ان ہی سے متاثر ہیں۔ شیخ محی الدین کی تصانیف پر مرزا کی گہری نظر ہے اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لہذا ہم آئندہ جو غالب کے صوفیانہ اشعار کی تشریح کریں گے وہ اسی رنگ میں ہوں گی۔ اس رنگ کے علاوہ غالب کے اشعار کی تشریح صحیح نہیں ہوگی۔

یہ ساری کائنات ایک نقش ہے جو قبل تخلیق نقاش (حق عز اسمہ) کے علم میں تھا۔ جس کو ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں ذہن میں تھا۔ کاتب جب کوئی لفظ لکھتا ہے، مصوّر جب کوئی تصویر بناتا ہے تو پہلے اس کی خیالی تصویر اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے۔ امام غزالی نے کائنات کو اسی لئے مکمل اور عجیب کہا ہے کہ یہ خالق کے علم کا ظہور ہے اس دنیا میں کوئی نقص نہیں، کیونکہ جہاں مطلق میں کوئی بخل نہیں، قدرت میں کوئی کمی نہیں، کامل کی جو بھی چیز ہوگی وہ کامل ہی ہوگی۔ غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ساری کائنات کسی نقاش کا نقش ہے جو نقاش کی صنّاعی کا گواہ ہے۔ اس جگہ افلاطون (۶۲۰ء



سے ۱۶۶۹ تک) نے بڑی ٹھوکر کھائی، چونکہ نبوت کا فیض نہیں پہنچا اسی لئے صاف  
کہہ دیا کہ نقاش اور نقش ایک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ساری کائنات خدا کا اشراق ہے  
جیسے آفتاب کی شعاع، مگر شعاع آفتاب سے جدا نہیں۔ یہی فلسفہ اشراقیت ہے۔  
اسی لئے جیمس براؤن اور نکلسن کو دھوکا ہوا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مسلمان  
صوفیاء نے ”ہمہ ادست“ کا تصور افلاطون اور ایرانی حکماء سے لیا ہے۔ اب دیکھئے  
اسلام کا مشہور صوفی (شیخ محی الدین ابن العربی) کیا کہتا ہے، اور قرآن و حدیث کا دامن  
پکڑتے ہوئے کس طرح اس پُل صراطِ حق سے گزر گیا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں ”کائنات کا  
نقش ازل سے خالق کے علم میں تھا۔ چونکہ خالق کا علم ازل ہی ہے لہذا نقش کا وجودِ علمی بھی  
ازل ہی ہوا۔ صوفیائے کرام اور محققین اسلام کے نزدیک انسان بھی عدم مطلق نہیں۔ عدم  
اضافی تھا۔ انسان یا کوئی شے یا کائنات پیدا ہونے یا ظہور میں آنے سے پہلے عدم مطلق  
نہیں ہوتی، عدم اضافی ہوتی ہے۔ عدم مطلق اُس کو کہتے ہیں کہ کوئی شے نہ خارج میں  
موجود ہو نہ خالق کے علم میں ہو۔ عدم اضافی اُسے کہتے ہیں کہ کوئی شے خارج میں موجود  
نہ ہو مگر خالق کے علم میں ہو، شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ عدم مطلق کوئی چیز نہیں ہے وہ پایا  
ہی نہیں جاتا۔ عدم اضافی اللہ کے علم میں پایا جاتا ہے خواہ خارج میں نہ پایا جائے۔  
شیخ محی الدین ابن العربی نے یہ نکتہ اپنے دماغ سے پیدا نہیں کیا بلکہ اپنی خدا داد ذہانت  
سے قرآن سے پیدا کیا ہے۔ اللہ عز و جل فرماتے ہیں:

اِذَا ارَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُوْلَ لَهٗ  
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

جب اللہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ  
کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ”ہو جا“

پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

دیکھئے الفاظ کس قدر سادہ و صاف ہیں، عرب کا ایک بد و بھی آسانی سے

سمجھ لیتا ہے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فلاسفر بھی غور و فکر کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔  
 شیخ اکبرؒ سوال کرتے ہیں کہ جب کوئی شے موجود ہی نہیں تو خالق کس کو کہتا ہے کہ  
 ”ہو جا“؟ اس کا جواب انھوں نے خود دیا ہے کہ شے خارج میں موجود ہونے سے  
 پہلے عدم اضافی کے مرتبہ میں رہتی ہے۔ یعنی اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔ اسی کو شیخ  
 ”عین ثابۃ“ کہتے ہیں۔ خالق اسی کو فرماتے ہیں ”ہو جا“ یعنی پردہ علم سے نکل کر خارج  
 میں (یا عالم شہود میں یا دنیا میں) آ۔ تو حکم کے مطابق وہ چیز ہو جاتی ہے۔ یعنی عالم  
 خارجی میں موجود ہو جاتی ہے، یہی تخلیق ہے۔ اسی کو عرف عام میں کہتے ہیں ”خدا نے  
 پیدا کیا“ اسی لئے قرآن کہتا ہے **اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ**۔ **الَّذِي يَخْلُقُ مَا**  
**يَشَاءُ**۔ شیخ کا موقف یہ ہے کہ کائنات اور کائنات کی ہر چیز ایک نقش ہے جو ذات حق  
 کی صورتِ علمی ہے، یہ نقش قائم بالذات نہیں بلکہ نقاش کے ذہن کا محتاج ہے۔ اللہ  
 کی ذات پاک اس کی مقوم ہے۔ نقش محدود و متعین ہے، صورت رکھتا ہے، لیکن نقاش  
 کے ذہن یا علم کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ ان تعینات سے آزاد ہے، نقاش عالم  
 اور نقش معلوم، شیخ کے نزدیک خالق اور مخلوق میں جو نسبت ہے وہ بڑھتی اور تخت کی سی  
 نہیں ہے جیسا کہ ظاہر پرستوں کا خیال ہے کہ بڑھتی نے ایک تخت بنا دیا اب بڑھتی کا اس  
 سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کے ساتھ ہی انلاطون کے نظریے کے برخلاف نقاش نقش نہیں  
 اور نہ ہی نقش نقاش ہے۔ بالفاظ دیگر دونوں میں عینیت نہیں بلکہ دونوں میں کلی غیریت ہے۔  
 غالب نے یہاں یہ کمال کیا ہے کہ وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے کے باوجود سارے  
 شعر کو وحدت شہود کے رنگ میں پیش کیا ہے اور خالق و مخلوق کی غیریت کو خوب اجاگر کیا  
 ہے۔ ع۔ ”نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا“۔ ”کس کی“ لفظ کی داغ نہیں دی  
 جاسکتی اگر گویا غالب نے یہ ثابت کر دیا کہ خالق و مخلوق میں گہری نسبت ہونے کے باوجود

غیریت مکتبی ہے۔ بالفاظِ دیگر "شے" خدا نہیں ہو سکتی۔ "شے" کے معنی یہ ہیں کہ جو خالق نے چاہا تھا۔ اُس کا خارجی وجود، لہذا "شے"، کسی حالت میں خدا نہیں۔ اس کا یہ ثبوت کچھ کم نہیں کہ واجب الوجود کے علم سے عالم شہود میں آتی ہے۔ اگر کسی صوفی نے "شے" کو یا خود اپنے آپ کو (کیونکہ وہ خود بھی شے ہے) خدا کہہ دیا تو وہ حالت سے مغلوب ہو گیا ہے اور حقیقت مستور ہو گئی ہے۔ اشیاء کی ذوات قبل تخلیق علم الہی میں ثابت ہیں۔ شیخ اکبر ان ہی ذوات کو اعیان ثابتہ، ماہیات اشیاء، حقائق اشیاء اور صورِ علمیہ کہتے ہیں۔ یہی حقائق خارج میں آنے کے بعد غالب کے "نقش قریادی" بنتے ہیں۔

✓  
 ۱۲/۱۲/۲۰۲۱  
 ۱۲/۱۲/۲۰۲۱

حکمتوں کے اصول و قواعد

الذات اللہ

ذات اللہ

ذات خلق

رہبریت  
و  
استقامت

مہجوریت  
و  
عبادت

رہبریت  
و  
استقامت

مہجوریت  
و  
عبادت

اتباع اوصیاء و اجتناب اوصیاء  
تربیان نذر و منت و غیرہ

توبہ و عطاء توکل صبر شکر خوف رجاء ذکر رضا

(قرآن اور تصوف میں)

# تصوف

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب  
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ مرزا صاحب نے یہ شعر شوخی سے کہا ہے، مگر ہم لفظنی طور پر کہتے ہیں کہ غالب اگر بادہ خوار نہ ہوتے تو ولی ہوتے۔ ولی خدا کا وہ خوش نصیب بندہ ہوتا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے اور کم سے کم گناہ کرتا ہے۔ سوائے نبی کے کوئی انسان معصوم نہیں ہو سکتا، اس پر صوفیائے کرام کا اجماع ہے۔ بہر حال غالب کا بلکہ ہر بندہ کا اپنے خالق سے الگ الگ معاملہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس موضوع پر بحث کرنی ہے، کہ "تصوف کیا ہے" جیسا کہ ہم تعارف میں عرض کر چکے ہیں "تصوف کی اصل قرآن ہے" احادیث میں اس کی تشریح ہے: "تصوف دل کی صفائی" کو کہتے ہیں۔ قرآن کے محاورہ میں اس کو "قلب سلیم" کہتے ہیں۔ قرآن میں رسول پاک کے دنیا میں آنے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے "يُرَكِّبُهُمْ" آپ کو دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ آپ بندوں کے قلوب کو کفر و شرک و گناہ کی آلودگیوں سے پاک صاف کر لیں۔ اس کے بعد آیت میں "کتاب و حکمت" کا ذکر ہے یعنی پہلے قلب کی صفائی لازمی ہے اس کے بعد ہی کتاب (قرآن) و حکمت (حدیث) کا درس دیا جاسکتا ہے۔ ایک آیت ہے "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّهَا" وہی بندہ فلاح تک پہنچے گا جس نے اپنے دل کو کفر و شرک اور گناہوں سے پاک رکھا۔ علامہ شبلی "الغزالی" میں لکھتے ہیں کہ

”تصوف کا لفظ اصل میں ”سین“ سے نکلا اور اس کا مادہ ”سوف“ تھا جس کے معنی یونانی زبان میں ”حکمت“ کے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو یہ لفظ عربی میں آیا۔ چونکہ حضرات صوفیا میں اشرافی حکما (افلاطون، ارسطو وغیرہ) کا انداز پایا جاتا تھا اس لئے لوگوں نے ان کو ”سونی“ یعنی حکیم کہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سونی سے ”صوفی“ ہو گیا تصوف علم باطن ہے لیکن اس کے نتائج عجیب و غریب ہیں جو مقامات سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کا ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا، چونکہ اسلام کے عقائد میں شامل ہے، عالم و جاہل، عام و خاص سب اس پر اعتقاد رکھتے ہیں لیکن عام لوگوں کو چونکہ اس مسئلہ کا علم تقلید یا استدلال سے ہوتا ہے اس لئے اس سے کوئی خاص حالت پیدا نہیں ہوتی انفعال و اعمال پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ برخلاف اس کے تصوف میں اس مسئلہ کا علم مشاہدہ اور کشف سے حاصل ہوتا ہے یعنی صوفی کو درحقیقت چاروں طرف خدای خدای نظر آتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر خشوع و خضوع، ہیبت و خوف، ادب و انقیاد کی وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جو کسی طرح علم ظاہری سے پیدا نہیں ہو سکتی۔“

قرآن میں ہے **يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ** اللہ اپنے مخلص بندوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت جبریلؑ ایک نواز و مسافر کی شکل میں حضورؐ کی خدمت میں آئے۔ اسلام و ایمان کے متعلق پوچھنے کے بعد دریافت کیا ”احسان“ (تصوف) کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا **تَعْبُدُ رَبَّكَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ** فَإِن لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (یعنی اپنے رب کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے، اگر اتنا مرتبہ تجھے حاصل نہیں تو یہ یقین کر کہ وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے صحابہؓ نے اکثر ذکر کیا کہ حضورؐ کے سامنے ہماری حالت ایسی ہو جاتی تھی گویا ہم جنت اور دوزخ کو دیکھ رہے ہیں اور جب اپنے بال بچوں کے پاس پہنچ جاتے تھے اس وقت

ہماری حالت ایسی نہیں رہتی تھی۔ اس کو تصوف میں علم حضوری کہتے ہیں۔ دیکھئے صحابہؓ پر یہ حالت طاری ہوتی تھی مگر وہ اس کا نام نہیں جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ سے بھی عرض کیا کہ آپ کے سامنے ہماری جو حالت ہوتی ہے وہ گھر پہنچ کر نہیں رہتی۔ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ اگر تمہاری حالت ہر وقت ایسی ہی رہتی تو تم سے راستہ میں فرشتے ملاقات کرنے لگیں اور تم کھانا پینا، راحت و آرام سب چھوڑ دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم باطن ہے، یہ اس حالت کا نام ہے جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بخاری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک رہے گا اگر وہ خراب ہوا تو سارا جسم خراب ہو جائیگا، یاد رکھو وہ قلب ہے۔ فصاحت اس کو کہتے ہیں۔ اگر ظاہری دل مراد لیجئے تب بھی یہی مطلب ہے اور اگر روحانی قلب مراد لیجئے تب بھی یہی مطلب ہے، کہ اگر انسان کو قلب کی صفائی حاصل ہوگی تو انسان میں ہزاروں اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں۔“

۱۰۴۰ امام غزالیؒ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو ذکر الہی سے آراستہ کیا جائے۔“

مختصر یہ کہ قلب اخلاق ذمیمہ سے پاک ہو اور اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو۔ امام غزالیؒ نے ظاہری (اکتسابی) علم کی مثال یہ دی ہے کہ کسی پردے پر خوبصورت نقش بنے ہوئے ہیں اور تصوف (صفائی قلب) کی مثال یہ دی ہے کہ اس پردہ کے سامنے آئینہ رکھ دیا جائے اور وہ نقوش اس آئینہ میں نظر آنے لگیں۔ صحابہؓ کو بھی تصوف حاصل تھا مگر اس وقت تک ”تصوف“ کا حادہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ بعض صحابہؓ کو ”شاہدہ“ ہوتا تھا۔ یہ ایک حالت ہے جس کے معنی ہیں کہ بندے پر ایسی حالت طاری ہو جائے گو یادہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

حق سبحانہ کا مقصد حالت پیدا کرنا ہے نام جاننا ضروری نہیں۔

حضور کے بعد مسلمان کا سب سے بڑا مرتبہ صحابیؓ ہونا تھا، ان کے بعد تابعین کا دور آیا، پھر تبع تابعین ہوئے۔ اسی زمانے میں فلسفہ کا دور شروع ہوا۔ یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوئے۔ اب ہر شخص دین کی باتوں میں عقل کو دخل دینے لگا، بعض علماء نے جو یہ حالت دیکھی تو معتزین کو جواب دینے کے لئے فلسفہ پڑھا۔ پہلے محققین صرف جواب پر اکتفا کیا کرتے تھے، مگر اب خود قرآن و حدیث کی باتوں کو عقل و فلسفہ کے معیار پر پرکھنا شروع کر دیا۔ جو مسائل عقل یا حکمائے یونان کے اصول کے مطابق نہ ہوئے ان سے یا تو انکار کر دیا، یا تاویل کرنے لگے۔ اب انتشار شروع ہو گیا۔ ہر گروہ نے اپنا جداگانہ عقیدہ بنا لیا۔ اسی زمانے میں مرجیہ، جہلمیہ، باطنیہ، جبریہ، قدریہ، توریہ، مشبہہ، مجسمہ، اور خارجی وغیرہ پیدا ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر فرقہ نے اپنے مسلک کی دلیل قرآن و حدیث سے پیش کرنی شروع کر دی۔ بعض نے دوسرے فرقوں کو بلکہ صحیح عقائد والوں کو کبھی کافر کہہ دیا۔ ہر طرف بغاوت کا ظہور ہونے لگا۔ مناظرے بلکہ مجادلے ہونے لگے۔ صرف عقائد کے اختلاف پر بغداد کے محلے اجڑ گئے، خواہ مخواہ مسائل پیدا کئے اور ان پر بحثیں شروع کر دیں۔ "قرآن مخلوق ہے یا نہیں"؟ اس بحث پر لوگ قتل ہونے لگے۔ امام احمد بن حنبل "قرآن کو مخلوق" نہیں کہتے تھے، ان کا قول تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس کی صفت ہے، اور خدا کی صفت مخلوق نہیں لہذا قرآن مخلوق نہیں، خلیفہ وقت نے ان بے چارے کے کوڑے لگوائے، جسم سے خون بہنے لگا۔ غرض ساری داستان توں چکاں، اُس زمانے میں کچھ خوش نصیب ایسے تھے جنہوں نے قرآن و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اپنی عقائد پر قرآن و سنت کو ترجیح دی۔ ان ہی حضرات نے فتنوں سے بچنے کے لئے بلکہ اپنے دین کو بچانے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہی حضرات صوفیاء کہلائے۔ تاریخ



میں ہے کہ سب سے پہلے صوفی کالقب ابوہاشمؒ کو ملا۔ چونکہ صوفیاء میں وحدت الوجود کا مسئلہ پیدا ہو چکا تھا، حکمائے یونان خود بھی اصل (خدا) اور ظل (مخلوق) کو ایک سمجھتے تھے اس لئے جہلاء کے لئے اباحت کا دروازہ کھل گیا۔ نماز، روزہ اور دیگر تکالیف شرعیہ کو اپنے سر سے اتار دیا، پھر خود ہی یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ بندہ جب خدا سے قرب حاصل کر لیتا ہے تو پھر شریعت کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ اس طور پر شرعی تکالیف سے بچنے کا خوب بہانہ ہاتھ آیا۔ چنانچہ عراقی کہتے ہیں سے

صَمَارَةُ قَلَنْدَرٍ سَزَا رِبْمَنْ نَمْسَائِي

کہ درازد دور دیدم، رہ درسم پارسائی  
یعنی اے پیر طریقت مجھے قلندری کا راستہ بتلا دے کیونکہ پارسائی (زائد بننے) کا طریقہ بہت بہت طویل اور دشوار ہے۔ ”طریقت“ کو علم سینہ“ قرار دیا اور ”شریعت“ کو علم سفینہ“۔ شرابِ ناب سے دل بہلانے لگے، حسن پرستی اختیار کی، قبروں کو سجدہ کرنے لگے،

جاہلوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو نہ سمجھ کر صاف اعلان کر دیا ہر چیز خدا ہے۔ ”ہمہ اوست“

ہم آگے اس مسئلہ کو اور واضح کریں گے مگر اس جگہ یہ نکتہ ضرور سمجھ لیجئے۔ ”فرعون

نے بھی کہا تھا ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى“ (میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں) اور حسین بن

منصورؒ نے بھی کہا ”أَنَا الْحَقُّ“ (میں ہی خدا ہوں) الفاظ یکساں ہیں مگر زمین اور

آسمان کا سا فرق ہے، مولانا رومیؒ بات کی تہہ کو پہنچے ہیں اور خوب کہا ہے

کارِ پا کاں را قیاس از خود مکیبے

گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

پاک لوگوں کی باتوں کو اپنی باتوں پر قیاس مت کر، کیونکہ لکھنے میں شیر اور شیر

یکساں ہی لکھے جاتے ہیں، اول ”شیر“ کے معنی ہیں ایک پھاڑ کھانے والا جانور، جو

انسان کو کھا لیتا ہے، اور دوسرے ”شیر“ کے معنی ہیں ”دودھ“ جس کو انسان پیتا

ہے، چنانچہ مرزا غالب جب یہ ورد کرتے تھے کہ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ (اللہ کے سوا کوئی

موجود نہیں) تو اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے لَا مَوْثِرَ فِي الْوَجُودِ إِلَّا اللَّهُ كَانَتْ  
 میں موثر حقیقی اللہ سبحانہ ہی ہیں، اور کوئی نہیں۔ اس نکتہ پر ایک مرتبہ اور غور کیجئے۔  
 ایک حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث قدسی ہے یعنی الفاظ رسول اللہ کے ہیں اور مضمون حق سبحانہ  
 کا ہے۔ فرماتے ہیں "میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک  
 کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اُس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے  
 دیکھتا ہے، اُس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے، اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس  
 سے چلتا ہے" ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں "اُس کا دل بن جاتا ہوں جس سے وہ  
 سمجھتا ہے، اُس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے" (بخاری و مشکوٰۃ)۔۔۔۔۔  
 اِس سے معلوم ہوا کہ صوفیائے کرام جو کہتے ہیں "فانی زخوش باقی بہ حق ہو جانا" یہ  
 تصور انہوں نے اسی حدیث سے لیا ہے۔ اسی کو "قرب و معیت" کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل  
 آگے آئے گی۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خود صوفیائے کرام "صوفی اور تصوف" کے متعلق کیا رائے  
 رکھتے ہیں۔ پہلے ہم صوفی کا نام لکھتے ہیں اس کے بعد اس کا قول لکھتے ہیں۔  
 حضرت جنید بغدادیؒ: صوفی، جس کا مرنا جینا محض خدا پر ہو۔  
 حضرت ابوبکر حریریؒ: صوفی تمام اخلاقِ حسنہ کا جامع اور تمام اخلاقِ رویہ  
 سے بری ہوتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ: صوفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو لیا ہے  
 حضرت منصور حلاجؒ: صوفی وہ شخص ہے کہ نہ اُس کو کوئی پسند کرے نہ وہ کسی کو پسند کرے  
 حضرت ابو معی رودباریؒ: صوفی وہ شخص ہے جو شریعتِ مصطفویٰ کو لازم کر لیتا  
 ہے اور دنیا کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

حضرت زکریا رازیؒ: تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہٴ نفوس، تصفیہٴ اخلاق،

اور تعمیرِ ظاہر و باطن کا علم ہوتا ہے تاکہ سعادتِ ابدی حاصل کی جاسکے۔

حضرت امام قشیریؒ: تصوف، صفائیِ قلب، صفائیِ باطن و تعمیرِ ظاہر و باطن ہے

حضرت امام غزالیؒ: تصوف، قلب کو غیر اللہ سے خالی کرنا اور ذکرِ الہی سے

آراستہ کرنا ہے۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ: تصوف، حظِ نفس کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت محمد بن قصابؒ: تصوف، اخلاقِ کریمہ ہیں، جو بہتر زمانہ میں،

بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت شہاب الدین سرہر دردیؒ: صوفیاء ہی مقررین ہیں۔

حضرت معروف کرخیؒ: تصوف، حقائق کی گرفت اور خلق سے مایوسی ہے۔

حضرت شبلیؒ: صوفی، خلق سے منقطع اور حق سے متصل ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ: صوفی، بلا حرکتِ اعضاء قلب مطمئن،

کشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد، خالق سے تعلق، تمام چیزوں سے بے پرواہ۔

حضرت بایزید بسطامیؒ: تصوف، دنیا کی ساری طبع کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت کتانیؒ: تصوف، خلق کا نام ہے، جو اخلاقِ حسنہ میں بڑھ گیا وہ

صفائیِ قلب میں بھی بڑھ گیا۔

23/12

# ظاہر و باطن

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے  
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

اس عنوان کا ”ہمہ اوست“ کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیونکہ اللہ عز و جل کا نام ”ظاہر“ بھی ہے، ھُوَ الظَّاهِرُ، ظاہر کو ظاہر ہونا چاہیے، وحدت الوجود کے قائل صوفیاء یہی کہتے ہیں کہ جب وہ ظاہر ہیں تو کائنات کے پردے میں ظاہر ہیں باطنیہ ان کا نور ان عنصری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ ذات پاک کو نہیں دیکھا جاسکتا صرف صفات کے پردے میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ جلوہ گری ساری آپ ہی کی ہے لیکن یہ جلوہ گری ہی پردہ بن گئی ہے۔ دوسری جگہ غالب ہی نے کہا ہے

ع ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں /

ایک شاعر نے ہر جگہ ان کی جلوہ آرائی دیکھ کر یہ نعرہ لگایا ہے سے  
 امروز چوں جمالِ تو بے پردہ ظاہر است در حیرتِ تم کہ وعدہ فردا برائے چلیت  
 یعنی جب آپ کا جمال آج بھی بے پردہ نظر آ رہا ہے تو مجھے حیرت ہے کہ آپ  
 نے فردائے قیامت کا وعدہ کیوں کیا؟

مگر ان کی صفت ”باطن“ بھی ہے۔ ”باطن“ ان کا صفاتی نام ہے لہذا ان کو صاف  
 نظر نہ آنا چاہیے۔ قرآن میں اس کی دلیل موجود ہے حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے

مرض کیا "ارنی" مجھے اپنا دیدار دکھائیے، جواب آیا "کن ترائی" تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ اس جواب سے ہی ظاہر ہے اللہ کی ذات پاک کو صاف طور پر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قیامت اور جنت میں جو دیدار کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ سچ ہے مگر چونکہ ذات پاک بیچوں ہے لہذا آنکھ کسی عالم میں بھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اب ہم اس نکتہ کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں، یہاں ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ پر غور کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ مقام انتہائی غور و فکر کا طالب ہے۔ بات چونکہ "جلوہ گری" کی چل رہی ہے لہذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

در اصل ذاتِ مطلق (ذاتِ حق سبحانہ) مرتبہ تنزیہیہ میں نامعلوم اور ناقابلِ علم ہے جبکہ مرتبہ تشبیہیہ میں قابلِ علم ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک یہی ذات پاک مختلف صورتوں میں نزول کرتی ہے مگر یہاں یہ نکتہ یاد رکھیے کہ نزول سے مراد حلول نہیں، نزول ایک اعتباری نام ہے، ذاک پاک عسی کی ویسی رہتی ہے وہ متناثر نہیں ہوتی، نزول کے بے شمار مرتبے ہیں محققین صوفیاء نے ان کو چھ مرتبوں میں حصر کیا ہے ان مراتب کو تنزلاتِ ستہ کہتے ہیں یعنی ذاتِ حق سبحانہ کے چھ نزول، اب غور کیجئے۔ (۱) احدیت (۲) وحدیت (۳) واحدیت (۴) روح (۵) مثال (۶) جسم (۷) انسان "مرتبہ اول احدیت" میں کوئی نزول نہیں، نزول دوسرے مرتبہ "وحدیت" سے شروع ہوتا ہے اور خبرات تک چھ نزول ہو جاتے ہیں۔ یہی تنزلاتِ ستہ "کہلاتے ہیں" (نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں)۔

"احدیت" سے ذات پاک مراد ہے، احدیت کے اعتبار میں نزول نہیں۔ ذات پاک حق سبحانہ اپنی گنہ اور حقیقت کے لحاظ سے ناقابلِ علم ہے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ جنت میں دیدار کر کے بھی ذات پاک سبحان کو نگاہ نہیں گھیر سکے گی۔ کسی انسان اور فرشتے کی پرواز تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مقام کی نسبت حضور نے فرمایا

ہے لَا تَفْکَرُوا فِی اللّٰهِ السّٰدِی ذَاتِ پَاکِ مِیْنِ غُورِہِ کُورِ۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔۔۔۔۔ ع۔ صد ہزاراں پر وہ آمدنا الہ۔ ذات حق سبحانہ تک لاکھوں پر دے پڑے ہوئے ہیں۔ حضرت ابو ذر نے دریافت کیا تھا ”کیا آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا تھا؟“ آپ نے فرمایا ”نُورٌ اَنّٰی اَرَاکَ“ وہ تو ایک نور ہیں میں ان کو کیسے دیکھتا! احادیث کے جو نام صوفیائے کرام نے رکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات حق کا عرفان ناممکن ہے مثلاً غیب الغیوب، ”معدوم الاشارات“ ”ملکون الملکون“ ”خفاء الخفاء“ ”قدم القدم“ ”عین مطلق“ ”ذات بلا اعتبار“ وغیرہ۔ یہ لا اوریت کا مرتبہ ہے۔ اسی مرتبہ کی نسبت شیخ اکبر فرماتے ہیں ”ذات پاک کی کنتہ تک پہنچنے میں ہم سب کے سب احمق ہیں۔“

”وحدیت“ یہاں سے نزول شروع ہوتا ہے۔ یہ اعتباری نزول ہے جو صوفیائے کرام نے اپنے کشف سے معلوم کیا ہے، اس مرتبہ کو تعین اول یا حقیقت محمدیہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ حقیقت محمدیہ ذات محمدیہ نہیں۔ دونوں الگ الگ حقائق ہیں۔ حقیقت محمدیہ ذات خداوندی کا مرتبہ نزول ہے اور ذات محمدیہ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چونکہ حقیقت محمدیہ کو ”نور محمدی“ بھی کہتے ہیں اس لئے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ کامل نور کا ظہور چونکہ ذات محمدی میں ہوا، اور اسی کامل نور سے اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نور محمدی سے اشیاء کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذات محمدیہ سے اشیاء کی تخلیق ہوئی۔ اس کو خوب سمجھ لیجئے ”واحدیت“۔ جب صوفی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ذات پاک کو اپنے اسماء و صفات و معلومات کی تفصیلات کا علم ہے اسی کو ”واحدیت“ کہتے ہیں۔ اسی کو تعین ثانی یا حقیقت انسانیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ تینوں مرتبے احدیت<sup>۱</sup>، وحدیت<sup>۲</sup>، و احدیت<sup>۳</sup> مراتب الہیہ کہلاتے

ہیں۔ ذات احدیت کو ”باطن“ کہتے ہیں۔ روح، مثال، جسم کو ”مراتب کونیہ“ کہتے ہیں۔  
 ”انسان“ صوفیاء کی اصطلاح میں ”مرتبہ جامعہ“ ہے۔ وحدیت، واحدیت، روح،  
 مثال، جسم کا نام ”حشرات خمسہ“ ہے۔ وحدت (یا وحدیت) اور واحدیت دونوں کو ظہور  
 علیٰ روح، مثال، جسم، انسان کو ”ظہور عینی“ کہتے ہیں۔ مثال کی تفصیل آئندہ آئے گی۔  
 اب یہاں سمجھ لیجئے کہ ان حجابوں میں مستور ہونا حق سبحانہ کی بڑی مصلحت ہے۔  
 بعض دہریے کہا کرتے ہیں ”دکھاؤ خدا کہاں ہے؟ جاہل خلاباز کہتے ہیں کہ ہمیں خلائیں  
 کہیں خدا نہیں ملا“ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا نظر آجائے تو کسی میں دیکھنے کی طاقت ہے؟  
 اور اگر دیدار و امی ہو تو کیا کوئی شخص اپنا کاروبار، کھانا، پینا، اولاد پیدا کرنا اور دیگر  
 مشاغل کر سکتا ہے؟ پر وہ ہی اس نے اس لئے چھوڑا ہے کہ مخلوق زندہ رہے، حضرت  
 جبریلؑ نے معراج میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ ”اگر میں ذرا اور اوپر اڑ جاؤں تو تجلی جمال  
 ذوالجلال سے میرے پر جل جائیں۔ قرآن میں ہے ”نگاہیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور  
 وہ نگاہوں کو دیکھ لیتا ہے“ کیونکہ وہ لطیف ہے۔ یاد رہے کہ وحدت اور  
 وحدیت ہم معنی الفاظ ہیں۔

کہہ سکتے کون کہ یہ جملہ گرمی کسی کی ہے !  
پر وہ چھوڑا ہے وہ اس نے نہ اٹھائے نہ بنے !

مرتبہ اولیٰ (۱۱)	ذات	مرتبہ ثانیہ (۱۲)	مرتبہ ثالثہ (۱۳)	مرتبہ رابعہ (۱۴)	مرتبہ خامسہ (۱۵)	مرتبہ ششمہ (۱۶)	مرتبہ سابعہ (۱۷)
آدریت	ذات	وحدیت	وحدیت	روح	مثال	بسم	انسان
باطن	حقیقتِ محمدیہ	ایمانِ ثابتہ	ایمانِ ثابتہ	ایمانِ ثابتہ	ایمانِ ثابتہ	ایمانِ ثابتہ	ایمانِ ثابتہ
ایک سے تین تک	مراتبِ الہیہ	چار سے چھ تک	مراتبِ انسانیہ	پار سے چھ تک	مراتبِ کونینہ	مرتبہ جامعہ	مرتبہ جامعہ
		دو سے چھ تک	خفہ مراتبِ خمسہ	چار سے چھ تک	مراتبِ کونینہ	مرتبہ جامعہ	مرتبہ جامعہ
		دو سے تین تک	ظہورِ علمی	چار سے سات تک	ظہورِ عینی	مرتبہ جامعہ	مرتبہ جامعہ
		دو سے سات تک	مراتبِ مرتبہ	مراتبِ مرتبہ	مراتبِ مرتبہ	مراتبِ مرتبہ	مراتبِ مرتبہ



# ذاتِ محمدی

## حقیقتِ محمدی

### نورِ محمدی

زہے شکوہ کہ اندر طراز صورت تو  
ز خود بر آمدن صورت آفریں پیدا است

رسول اللہؐ کی تعریف میں غالب کا یہ نہایت فصیح و بلیغ شعر ہے۔ یعنی اس شعر میں یہ کمال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف ذاتِ محمدی بلکہ حقیقتِ محمدی پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ "حقیقتِ محمدی" شیخ محی الدین ابن العربیؒ کا مشکل ترین موضوع ہے۔ مگر عوام کو نورِ محمدی کے لفظ سے بہت دھوکا ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "أحد" اور "احمد" میں صرف "میم" کا فرق ہے۔ اسی لئے ہم اس کی تشریح کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

ہم پہلے غالب کے اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ شکوہ کے معنی ہیں شوکت و ودبہ، شان، رعب، جلال۔ مطلب یہ ہے۔ "اے نبی پاکؐ آپ کی صورت میں کیا رعب و جلال ہے کہ جس نے آپ کی صورت کو دیکھ لیا گویا صورتِ آفریں (خالق) کو دیکھ لیا۔ یہ محض شاعری نہیں بلکہ غالب نے ایک حدیث کا ترجمہ ہی کر دیا ہے

حدیث یہ ہے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ یعنی بیشک اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ انسانوں میں حضور سب سے زیادہ صاحب جمال تھے جو فیائے محققین کا خیال ہے کہ انسان منظر ذاتِ احدیہ اور ساری اشیاء منظر صفات ہیں۔ خود شیخ اکبرؒ کی ہی رائے ہے۔ وہ اس سے انکار کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کا مسلک وحدت الوجود ہے۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے ”فتوحات مکیہ“ میں اس مقام کی جو تشریح کی ہے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو تصور پیش کیا ہے اس کو ہم اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں۔

”جیسا کہ ہم ”ظاہر و باطن“ کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں ذاتِ وحدیت کو ہی حضرت شیخ اکبرؒ ”حقیقت محمدی“ کہتے ہیں۔ اس کو ”عقل اول“ بھی کہتے ہیں۔ عقل اول تمام خالق اشیاء پر محیط ہے۔ اس تعین اول کو حقیقت محمدیہ کیوں کہتے ہیں؟ دراصل ”احدیت“ اللہ کی ذاتِ محض ہے۔ یہاں ذاتِ سبحان بہت متنزہ علم بلکہ قید تشریح سے بھی مقدس ہے۔ بے رنگ و بے کیف ہے۔ یہاں کوئی تنزل نہیں ہے۔ تنزل وحدیت کے مرتبہ سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ انسان بھی شے ہے لیکن ذواتِ اشیاء میں نور کا ظہور سب سے زیادہ ذواتِ انسانیہ میں پایا جاتا ہے چونکہ انسانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مظہر انتم ہے کیونکہ آپ انسانِ کامل ہیں، لہذا وحدیت کا ظہور بھی یہاں کامل ہے۔ اسی لئے شیخ اکبرؒ نے اس کو ذاتِ محمدی کی حقیقت کہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک وحدت (یا وحدیت) کا دوسرا نام حقیقت محمدیہ ہوا۔ ابو شیخ، طبرانی اور ابو نعیم نے یہ احادیث نقل کی ہیں۔ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ عَقْلًا سَبَّحَ مِنْهُ پیلے خدا نے عقل کو پیدا کیا۔ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرًا سَبَّحَ مِنْهُ پیلے خدا نے نور کو پیدا کیا۔ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ رُوْحًا سَبَّحَ مِنْهُ پیلے خدا نے روح کو پیدا کیا۔ شیخ اکبرؒ اور ان کے متبعین وحدت کو ذاتِ محمدی کی حقیقت کہتے

ہیں اسی کو حقیقت محمدیہ کہا جاتا ہے۔ حقیقت محمدی کو نور محمدی کہتے ہیں۔ ذات محمدی رسول اللہ کی ذات کو کہتے ہیں جو عید ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کہتے ہیں کہ حقیقت محمدی ظہور اول ہے اور حقیقت الخاق ہے یعنی انبیاء کرام اور ملائکہ عظام کے خالق اس کے ظلال کی طرح ہیں یعنی انبیاء اور ملائکہ کی حقیقتیں حقیقت محمدی کا پرتو ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ نے فرمایا ہے **أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي**۔ دوسری جگہ فرمایا ہے **خُلِقْتُ مِنْ نُورِ اللَّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ مِنْ نُورِي** میں خدا کے نور سے پیدا ہوا اور مومنین میرے نور سے پیدا ہوئے۔ لہذا حقیقت محمدی، حق جل جلالہ اور ساری حقیقتوں کے درمیان واسطہ ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو منزل اور واسطہ کی کیا ضرورت تھی براہ راست ہی کیوں پیدا نہیں کر دیا۔ اس کا جواب حضرت مجدد الف ثانی نے یہ دیا ہے کہ عالم کے پیدا کرنے کی وجہ حُب ہے یعنی محبت، حق سبحانہ کو اپنی ذات پاک سے محبت ہے وہ چاہتے ہیں کہ ان کو پہچانا جائے۔ اس حُب کے باوجود ان کو عالم اور ایجاد عالم سے استغناء ہے **إِنَّ اللَّهَ كَغْنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ** نص قاطع ہے اور اس کا ثبوت ہے۔

تبعین اول تبعین حسی ہے اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ تبعین حُب ہے۔ یہی

حقیقت محمدی ہے۔ حضرت مجدد، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی حقیقت کو بھی حقیقت محمدی

کا ظل (پرتو) کہتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں **حَقِيقَةُ حَضْرَتِ صَدِيقِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ** یعنی رب اواز اسماء

الہی جل سلطانہ کہ مبداء تبعین اوست بے توسط امرے ظل حقیقت محمدی است برہنجہ کہ ہرچہ

دراں حقیقت کائن است بہ طریق تبعیت و وراثت دراں ظل ثابت ہے پھر فرماتے ہیں

”یہی وجہ ہے کہ صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس امت میں سب سے افضل اور اکمل ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا ہے ”اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے سینہ میں ودیعت فرمایا ہے وہی

اللہ نے ابو بکر صدیقؓ کے سینہ میں رکھ دیا ہے۔ حقیقت اسرافیل بھی وہی حقیقت محمدی ہے۔ اس کے بعد وضاحت کی ہے کہ رسول پاکؐ کے سینہ میں کلمت ہے اور ابو بکر صدیقؓ کے سینہ میں جبریت ہے، بس دونوں میں یہی فرق ہے۔

جو لوگ ذات محمدیؐ اور حقیقت محمدیؐ کو ایک سمجھتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے

کہ ذات محمدیؐ (رسول اللہ کی ذات پاک) عالم امکان میں ہے۔ حقیقت محمدی ذات خداوندی ہے۔ امکان، حقیقت نہیں بن سکتا۔ یہ موقع بہت نازک ہے اس لئے ہم

حضرت مجددؑ کے اصل الفاظ نقل کرتے ہیں۔ دریاں جا ایکہ یہ تصور انھوں نے حضرت

شیخ اکبرؒ سے لیا ہے۔ حضرت مجددؑ کے الفاظ بعینہ یہ ہیں: "آنحضرت علیہ وعلی آلہ

الصلوٰۃ والسلام نیز باعلوئے شان و باآ جاہ و جلال ہمیشہ ممکن است و ہرگز از امکان

نہ خواهد برآمد۔ و جو بہ نہ خواهد پیوست یعنی آنحضرت علیہ و آلہ الصلوٰۃ والسلام باوجود

ان کی شان بہت اعلیٰ ہے اور حضور بہت جاہ و جلال رکھتے ہیں، تاہم امکان (مخلوقی) سے

اوپر ہو کر واجب (حق) نہیں بن سکتے۔ یعنی بندہ بندہ ہی رہے گا اور رب، رب رہے گا۔

اس موقع پر ہم پھر شیخ محی الدین ابن العربیؒ کا قول یاد دلاتے ہیں کہ "بندہ بندہ ہی رہے گا

خواہ کتنی ہی ترقی کرے اور رب رب ہی رہے گا خواہ کتنا ہی تنزل کرے۔ لہذا ذات

محمدیؐ۔ حقیقت محمدیؐ (یا نور محمدیؐ) نہیں بن سکتی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ذات

محمدیؐ اور نور محمدیؐ دو الگ الگ حقائق ہیں دونوں کو ایک سمجھ لینا یا محمدؐ کا رتبہ رب کی

برابر قرار دینا الحاد ہے، زندقہ ہے، کفر ہے۔ جامیؒ نے رسول اللہؐ کی شان میں خوب

کہا ہے۔ ص۔۔۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔



# تقدیر

✓ توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے  
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہرنہ ہوا تھا

تقدیر، اسلام میں بہت معرکہ الآرامئلہ ہے۔ عام مسلمانوں میں تقدیر کے متعلق اس قدر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اگر ہم کو غالب کا یہ شعر نہ ملتا تو بھی ہم اس مسئلہ پر الگ بحث کرتے۔ ہم نے تو بعض تعلیم یافتہ حضرات کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ ”تقدیر“ اسلام کا بہت کمزور مسئلہ ہے، عام مسلمان تو تقدیر پر بھروسہ کر کے بے عمل بن گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اپنی جان کو مصیبت میں ڈالنے سے کیا فائدہ، جو قسمت میں ہے وہ تو ملے گا ہی۔ بعض احمقوں کو دولت ملتی دیکھ کر عام آدمیوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہے بس تقدیر ہے، جدوجہد بالکل بیکار ہے۔ ایسے لوگوں کو مجمل طور پر صرف اتنا معلوم ہونا چاہیے کہ ”تقدیر“ خالق کی معلومات کو کہتے ہیں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تقدیر کے متعلق غالب کا یہ شعر بے نظیر ہے۔ اس شعر کے مقابلہ میں جب ہم انشائے شعر پر نظر ڈالتے ہیں تو فرق بعد المشرقین نظر آتا ہے۔ انشا کہتے ہیں سے

قسمت میں جو لکھا ہے وہ پونچے گا آپسے پھیلائیے نہ ہاتھ، نہ دامن پساریے

رسول اللہ سے زیادہ تقدیر کو کون سمجھے گا مگر پوری زندگی پر نظر ڈالنے ساری عمر جدوجہد

اور سچی پیہم میں گزری، حضور سے زیادہ متوکل کون ہوگا مگر آپسے کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں

بیٹھے۔ باوجودیکہ آپسے تقدیر پر ایمان لانے کی تلقین کی ہے۔ غالب کا یہ شعر بھی اتنا ہی

مشکل ہے جتنا اقبال کا یہ شعر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پہلے غالب کے شعر کا ظاہری مطلب سمجھئے۔ اس شعر میں تصوف اس طرح بند کر دیا گیا ہے

جس طرح کوزے میں دریا کو۔ یا بقول شیخ محی الدین ابن العربیؒ ”گٹھلی میں درخت کو“ توفیق

کہتے ہیں انسان کے اس ارادے کو جو خالق کے ارادے کے موافق ہو جائے۔ ازل میں جس

ہمتی (خصوصاً انسان) کی جو ہمت تھی اسی کے مطابق اس کی تقدیر بنی۔ ایک قطرہ آنکھ کا

آئینہ بنا، دوسرا قطرہ صدف میں گومر بنا، دونوں قطروں کی تقدیر دونوں کی ہمت کے مطابق

بن گئی۔ ازل ہمت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے چند خفائق ذہن

میں رکھنے ہوں گے۔ تقدیر کے معنی ہیں ”اندازہ“۔ خداوند عالم نے کائنات کو پیدا کرنے سے

پہلے اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ یہی اندازہ غالب کے نزدیک وہ نقش ہے جو نقاشِ ازل کے

ذہن میں تھا اور اس کے بعد عالم شہود میں جلوہ گر ہوا۔ امام غزالیؒ کا تصور یہ ہے کہ

تقدیر لوح محفوظ میں اس طرح لکھی ہوئی نہیں ہے جس طرح کوئی تحریر تختی پر لکھی ہوئی ہوتی ہے،

بلکہ وہ تحریر خدا کے علم میں ایسی ہے جیسے حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن لکھا ہوا ہوتا ہے

واقعی یہ قرآن حافظ کے دماغ میں ہے لیکن کوئی ”ایکسرے“ ایسا ایجاد نہیں ہوا ہے جو

اس کی تصویر اتار لے۔

اس کو ہر زمانے کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں کہ خدا کا علم بسیط ہے اس کے

سامنے کائنات ”گٹھلی ہوئی کتاب“ کی طرح ہے۔ اس کے سامنے ظاہر و باطن ایک ہی درجہ

رکھتے ہیں سب کچھ اسی کے علم کے مطابق ہوگا۔ انسان جو کچھ بھی عمل کرنے کا وہ بھی خدا کے علم

کے مطابق ہوگا مگر اس کیفیت کی تعبیر میں سوائے اہل سنت کے سب نے ہی ہر زمانے میں

غلطیاں کی ہیں مثلاً حبر یہ فرقہ کے علماء کہتے ہیں ”انسان خدا کے علم کے مطابق ضرور عمل کرے گا

اس میں وہ مجبور محض ہے۔ ان کی نظر سے قرآن کی یہ آیت اوجھل ہو گئی ہے قَسَمٌ مِّمَّا  
 قَلْبُودَمِنْ جُوعًا هَمُّ مَوْنٌ هُوَ جَانَةٌ اس کے اختیار میں ہے۔ اس فرقے کے مقابلے میں  
 دوسرا فرقہ معتزلہ ہے اس عقیدے کے لوگ اب بھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ اس  
 فرقہ کا تصور یہ ہے کہ انسان اپنے فعل میں خود مختار ہے بلکہ اپنے فعل کا خود خالق ہے۔ اگر اس  
 عقیدہ کو مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان خدا سے زیادہ چیزیں پیدا کر سکتا ہے  
 مثلاً انسان سارے دن کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے وہ ان سارے افعال کا خالق سمجھا جائے گا  
 کیونکہ ان کے نزدیک خدا انسان کے ان افعال کا خالق نہیں، وراں حالیکہ اس عقیدے کے  
 خلاف قرآن کی یہ آیت موجود ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ اور اللہ نے تم کو بھی  
 پیدا کیا اور جو کچھ عمل تم کرتے ہو ان کو بھی پیدا کیا۔

اگر قرآن و حدیث پر صحیح طور پر عمل کرنا ہے تو ساری آیات و احادیث کو سامنے رکھنا  
 ہوگا۔ انسان بلاشبہ اپنے ارادے میں آزاد و خود مختار ہے مگر اس کو شترے ہمارے نہیں  
 چھوڑا گیا ہے، دوسری طرف اس قدر مجبور نہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں۔ اگر ایسا ہے  
 تو پھر اس کو جزا و سزا کیسی؟ خداوند کریم ظلم نہیں کرتے کیونکہ جبر ظلم ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے  
 کہ خدا کی نسبت بندہ سے ایسی نہیں جیسے بڑھی اور تخت کی ہوتی ہے بلکہ خالق اور مخلوق کا  
 تعلق دائمی اور قریبی ہونا ضروری ہے، اس کی ذات پاک قیوم ہے، اسی وجہ سے نہ صرف  
 انسان بلکہ ساری کائنات قائم ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے بالکل صحیح فرمایا ہے اَلْاِسْلَامُ بَيْنَ الْجَبْرِ وَالْاِخْتِيَارِ  
 اسلام جبر اور اختیار کے درمیان ہے۔ خدا کی معلومات ازلی ہیں ہمیشہ سے ہیں معلومات  
 الہی کے مطابق واقعات کا ظہور ہونا لازمی ہے مگر معلوم ہونا جبر و ظلم نہیں۔ اگر اس ہستی کا علم  
 اس قدر وسیع ہے کہ ابد تک کے حالات کو جانتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ فلاں شخص کو

اچھے اعمال کی وجہ سے جنت ملے گی اور فلاں آدمی بُرے اعمال یا فاسد عقائد کی وجہ سے  
دوزخ میں جائے گا تو یہ ہرگز ظلم نہیں۔ حق سبحانہ کو معلومات ہونے کے ساتھ قدرت بھی  
ہے وہ جس بندے سے خوش ہوں اس کو بُرائیوں اور ہلاکتوں سے بچا سکتے ہیں اور بچاتے  
ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کسی جگہ جانے والے تھے وہاں طاعون پھیلا ہوا تھا یہ سن کر وہ  
واپس ہونے لگے، ایک شخص نے کہا ”کیا تقدیر الہی سے بھاگتے ہو؟“ حضرت عمرؓ نے جواب  
دیا جَلِي نَحْنُ نَقِيرُ مِنَ قَدْرِ اللّٰهِ اِلٰى قَدْرِ اللّٰهِ (ہاں ہم تقدیر الہی سے تقدیر  
الہی کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں) یعنی یہاں تک میرا آنا اور اب یہاں سے واپس جانا  
سب تقدیر میں تھا۔

ہمت کیا ہے؟ ہمت دراصل ”عین“ ہے۔ اس کو تصوف میں ”عین ثابِتہ“  
کہتے ہیں۔ ہر انسان اپنے عین کے مطابق عمل کرتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حق سبحانہ ازل  
سے عالم ہے، اس کا علم ازلی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے، علم بغیر معلومات کے ناممکن ہے علم  
ازلی ہوا تو معلومات بھی ازلی ہوتیں۔ علم حق سبحانہ کی صفت ہے، صفت ذات سے منفک  
(جدا) نہیں ہو سکتی۔ حق سبحانہ کی ان ہی معلومات کو صوفیاء ”اعیان ثابِتہ“ صُوْرِ عَلِيَّہِ خَقَائِقِ  
الْمَمْكَنَاتِ، یا اَزْلِ مَمْكَن“ کہتے ہیں۔ اعیان، عین کی جمع ہے، ہر شے کا ایک عین ہے اور ہر عین  
کی ایک خصوصیت ہے اسی خصوصیت کو فطرت کہتے ہیں۔ عین کی قابلیت یا اقتضائے ذاتی کو  
قرآن کی زبان میں ”شاکلہ“ کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ  
ہر شخص اپنے اقتضائے ذاتی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ غالباً اسی شاکلہ کو ”ہمت“ کہتے ہیں۔  
یعنی توفیق ہر شخص کے اقتضائے ذاتی کے مطابق ہوتی ہے اور اسی کے مطابق وہ عمل کرتا ہے |  
تخلیق کیا ہے؟ حق سبحانہ کی معلومات یا اعیان ثابِتہ کا فارغ میں انکشاف۔

اس نکتہ پر پھر غور کیجئے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ہر انسان کا عین الگ الگ ہے بلکہ



گھوڑے، مرغ، شیر کے اعیان الگ الگ ہیں۔ ہر ذی روح اپنے عین کے مطابق عمل کرے گا۔

اس حد تک جبر ہے جیسا کہ سفید رنگ، طویل قامت ہونا، لپٹ قامت ہونا، کم عقل ہونا

اس حد تک مجبوری سے عمل میں کوئی مجبوری نہیں۔ قطرہ جو موتی بنا اس کا عین اور تھا، جو

قطرہ آنکھ کا آنسو بن گیا اس کا عین دوسرا تھا، ہر قطرہ کی ازلی ہمت اسی کی منقاضی تھی اس

کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا، بادشاہوں کی اولاد کی فطرت میں ملک گیری ہوتی ہے ایک

گدا گری یا معمولی آدمی بادشاہ بننے کی نمتا کر ہی نہیں سکتا۔ شیخ محی الدین ابن العربی نے اس

حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "کسی عین کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی خصوصیت

اہلیت اور ذاتی استعداد کے سوا کسی اور وجود میں ذاتی اور صفاتی اعتبار سے ظاہر ہو جائے"

(نصوص الحکم)۔ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اگرچہ ارادہ میں آزاد ہے

مثال کے طور پر سمجھ لیجئے کہ انسان سے شیر، گھوڑے اور مرغ وغیرہ جیسے کام نہیں ہو سکتے خواہ

وہ ساری عمر دعائیں مانگتا رہے۔ انسان اپنے فعل کا کاسب ہے خالق نہیں، یہ خلاف

معتزلہ۔ انسان کی صرف وہ دعائیں قبول ہوتی ہیں جو اس کے اقتضائے ذاتی کے مطابق

ہوں۔ مثلاً کوئی معمولی آدمی یہ دعا مانگنے لگے کہ وہ کسی ملک کا بادشاہ بن جائے تو یہ دعا قبول

نہ ہوگی کیونکہ ایسا مانگنا گویا اس کے عین کے خلاف ہوگا یا دیکھئے کس قدر بلیغ آیت

ہے **وَ اَنَّا كُمْ مِنْ كَلْبٍ مَّا سَلْتُمْوهَا** شیخ اکبر کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں

یعنی پروردگار نے وہ سب کچھ تم کو عطا کیا ہے جو تمہارے عین نے تعان استعداد سے مانگا

تھا۔ علامہ اقبال اپنی فلسفیانہ کتاب **RECONSTRUCTION** میں لکھتے ہیں۔

"تقدیر کوئی قوت ظاہرہ نہیں جو خارج نشے پر یہ جبر عمل کر رہی ہو بلکہ وہ خود

نشے کی باطنی رسائی ہے، اس کے وہ قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی

فطرت میں ضمیر میں جو بغیر خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔"

علامہ اقبال واضح طور پر کہہ رہے ہیں "تقدیر بہ جبر کسی پر مسلط نہیں کی جاتی بلکہ انسان کے عین کا تقاضا ہے، ان الفاظ کو بدل کر انھوں نے عوام کو سمجھانے کے لئے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں "وہ خود شے کی باطنی رسائی ہے" یعنی انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے مشہور فقرہ ہے "ازدست کہ برماست" ہم کو جو کچھ بھی بڑا یا بھلا ملتا ہے وہ خود ہماری فطرت کے تقاضے سے ملتا ہے باہر سے کوئی چیز مسلط نہیں کی جاتی۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں اِنَّ الْحَقَّ لَا يُعْطِيْهِ اِلَّا مَا اَعْطَاهُ عَيْنُهُ یعنی حق تعالیٰ کسی انسان کو وہی سب کچھ عطا فرماتے ہیں جو اس کا عین (انتضائے ذاتی) عطا کرتا ہے۔ حق سبحانہ کی عطا اس کے عین سے آگے نہیں برکتی اقبال کے اس مشہور شعر کے معنی اس جگہ معلوم ہوں گے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے  
عوام سمجھتے ہیں کہ خودی جب بلند ہو جاتی ہے تو خدا بندے سے زبانِ قال سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے تاکہ اسی طرح کیا جائے۔ یہ غلط ہے ایسا مطلب اس شعر کا ہو ہی نہیں سکتا۔ خودی کو بلند کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے عین کو سمجھے بالفاظ دیگر اس کی ازلی ہمت کیا ہے، اس ازلی ہمت سے زیادہ اسے کچھ نہیں ملے گا بلکہ خودی کو سمجھنے والا اس سے زیادہ مانگ ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت کا تقاضا نہیں اور جو فطرت کا تقاضا ہے وہی تقدیر ہے۔

تقدیر کے مسئلہ کو ایک مرتبہ اور سمجھ لیجئے کیونکہ عوام میں اس مسئلہ پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ حق سبحانہ کی معلومات اور بات ہے اور کی بندہ کو یا پوری قوم کو نعمتوں میں رکھنا یا تکلیف میں مبتلا کرنا اور بات ہے، خالق ہر کام حکمت سے کرتا ہے ضروری نہیں کہ بندے پر تکلیف کو سمجھ ہی جائیں۔ دیکھو ماں اپنے بچے کو نہلاتی ہے اس کا میل اتارنی ہے بچہ

روتا ہے اور اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ ماں اس پر ظلم کر رہی ہے مگر عاقل سمجھتا ہے کہ ماں اس کے ساتھ بھلائی کر رہی ہے۔ بعض تکلیفوں کے اچھے نتائج بندے کو خود بھی معلوم ہو جاتے ہیں مگر ہر بات میں عقل اور احساس کی ضرورت ہے۔ بعض واقعات کا نتیجہ کسی کسی سال کے بعد نکلتا ہے بلکہ بعض دعائیں بندے کی اس لئے قبول نہیں ہوتیں کہ اگر ان کو قبول کر لیا جائے تو اس سے دعائیں لگنے والے کو نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ حق سبحانہ خمیر ہے ان کے سامنے ہر بندے کی زندگی ازل سے ابد تک کھلی ہوئی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہر شخص کا ایک "عین" ہے، ہر شخص کی ایک استعداد ہے اس کے مطابق اس کو بارگاہ خداوندی سے ملتا ہے، اگر ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق معاملہ نہ کیا جائے تو وہ ہلاک ہو جائے۔ تقدیر کو ماننے سے آدمی مطمئن رہتا ہے جو کچھ ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ تقدیر میں ایسا ہی ہونا تھا اور جو کام نہیں ہوتا تو وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کے علم سے باہر کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے تو وہ ہو گا ہی، پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ۔ خود چند صحابہؓ نے یہی کہا تھا اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا اَعْمَلُوا فَاَكَلُ مَيْسَرًا لِمَا خُلِقَ لَكُمْ عَمَلٌ كَيْتَ جَاوِہْرُ شَخْصٍ اُسْ تَكْ اَسَانِي سِي پُوْرَجْ جَانِي كَا جُو كُچھ اَسْ كِي لِي پِي اَكِيَا كِيَا هِي۔ /

اسلام کے سب سے بڑے صوتی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ تقدیر کے مسئلہ کو بزرگ ترین علوم میں سے ایک علم قرار دیتے ہوئے "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں :-  
 "تقدیر کا راز، عظیم ترین علوم میں سے ہے حق تعالیٰ اس علم سے اسی کو آگاہ کرتے ہیں جس کو انھوں نے اپنی معرفت کے لئے مخصوص کر لیا ہے،" *فصوص*  
 شیخ کا یہ اشارہ اپنی طرف ہے اور ہم نے بھی جو کچھ اس مسئلہ پر لکھا ہے سب اسی کے ہی

دسترخوان کی ریزہ چینی ہے۔ ورنہ خود ہم اس قابل نہیں ہیں۔

کسا ایک مرتبہ چند صحابہؓ نے رسول اللہؐ سے پوچھا ”ہم جو جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور  
دوائیں استعمال کرتے ہیں کیا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟“ آپ نے فرمایا  
”یہ بھی حق سبحانہ کی تقدیر سے ہی ہوتا ہے (ابن ماجہ و ترمذی و احمد)“

ایک مرتبہ حضورؐ نے فرمایا ”کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک  
اس پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر دونوں اللہ نے پیدا کئے ہیں (بخاری و مسلم)“  
(خیر و شر کے عنوان کے تحت الگ بحث کی گئی ہے اس پر بھی غور کیجئے)

اس موقع پر یہ معلوم کیجئے کہ سب انسان اپنی فطرت اور اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے  
مختلف ہیں۔ ایک باہمت شخص چند رفیقوں کی مدد سے ایک ملک پر قبضہ کر سکتا ہے اور ایک  
بزدل کسی بہادر کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مگر خدا کی بارگاہ عالیہ سے اجر و نون  
کو ملتا ہے۔ اعمال اور کسب میں سب کا مرتبہ ایک ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں  
فرمایا گیا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۗ ✓ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی اس کی گنجائش (فطر و طاقت  
لہا ما کسبت۔ سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اسکو وہی ملتا ہے جو  
(سورۃ بقرہ)۔ اس نے کیا ہے۔

امام حسنؓ فرماتے ہیں ”اللہ تعالیٰ کی اطاعت بہ جبر نہیں ہو رہی ہے اور نہ  
ان کی نافرمانی میں قوتِ قاہرہ کار فرما ہے“

اسن راز کو علامہ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں خوب بیان کیا ہے۔

ارضیاں، تقد خودی درباختند      نکتہ تقدیر را شناختند  
رمز بار بیکش بہ حرفے مضمراست      تو اگر دیگر شوی او دیگر است

روتا خاک شو، نذر ہو اساز و ترا سنگ شو، بر شیشہ انداز و ترا  
 شبنمی؟ افتدگی تقدیر نشت قلزمی؟ پائیدگی تقدیر نشت

یعنی تقدیر کا ایک باریک راز یہ ہے کہ تم جو کچھ بھی اپنی فطرت کے مطابق ہو  
 ویسا ہی عمل تم سے ہوگا۔ اگر تم مٹی بن جاؤ تو ہوا میں اڑ جاؤ گے، اگر پتھر بن جاؤ تو  
 ہوا میں نہیں اڑ سکتے مگر شیشہ پر پھینکے جاسکتے ہو۔ اگر تم شبنم ہو تو تمہاری قسمت  
 میں اوپر سے نیچے گرنا اور فنا ہو جانا ہے، اگر تم دریا ہو یا سمندر ہو تو تمہاری تقدیر  
 میں پائیدگی اور بقا ہے۔ یعنی تمہاری تقدیر انقضاے فطرت کے مطابق ہوگی۔

انسان اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ تقدیر کی وجہ سے مجبور ہے  
 حالانکہ وہ اپنی قابلیت (عین) کے لحاظ سے مجبور نہیں بلکہ وہ اس موہومہ "تقدیر"  
 کو بھی توڑ سکتا ہے۔

اقبال نے ایسے عقیدے رکھنے والوں کو یوں جھنجھوڑا ہے کہ

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں

نادانی جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی ۲۶/۱۲



(رجحاً تا)



جب لیکھو

خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ

خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ

خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ

خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ

خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ خداوندی قدرت سے بے خبری سے کہتا ہے کہ

# فَا بَقَا

”ہم ازوست“ ہم ازوست“

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

”دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر“ یہ وحدت الوجود ہے اس کو توحید و جود بھی کہتے ہیں، ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا“ یہ وحدت الوجود ہے اس کو توحید شہودی بھی کہتے ہیں۔ ”وحدت الوجود“ کے عقیدے میں صوفیاء ا فلاطون کے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ وحدت الوجود والوں کا ”حال“ یہ ہوتا ہے کہ ہر چیز خدا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی کی ساری مثنوی اسی عقیدے کی گویا تشریح ہے۔ یہ صوفیاء کا بڑا معرکہ الآراء مسئلہ ہے۔ چشتیہ صابریہ کا مسلک تو وحدت الوجود ہی ہے۔ مولانا اسماعیل شہید زاہد خشک مشہور ہیں لیکن جہاں تک ”حال“ کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر یہ الفاظ بے ساختہ لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں

”جس طرح لوہے کے ٹکڑے کو آگ میں ڈال دیتے ہیں تو وہ لوہے

کا ٹکڑا آگ کے انگاروں کے شمار میں ہو جاتا ہے، لیکن نہ صرف

اس وجہ سے کہ وہ لوہا اپنی حقیقت کو چھوڑ کر خالص آگ کی حقیقت

سے بدل گیا ہے، کیونکہ یہ امر تو صریح البطلان ہے بلکہ یہ لوہے کا ٹکڑا

فی الحقیقت لویا ہی ہے۔۔۔۔۔ اگر اس حال ہی میں اس آہن پارہ

کو بولنے کی طاقت ہوتی تو تنو زبان کے ساتھ اپنی اور آگ کی عینیت

اور یکجان ہونے کا شور مچاتا اور خواہ مخواہ ایک ساعت کے لئے اپنی

حقیقت سے غافل ہو کر یہ کلمہ بول اٹھتا کہ میں جلاتے والی آگ کا انگارہ

ہوں، باورچیوں، لوہاروں، ستاروں بلکہ سارے پیشہ ورکارپگروں کے

کاروبار میرے ساتھ وابستہ ہیں جب اس طالب کے نفس کو روحانی کشش

اور جذب کی موجیں احدیت کے دریاؤں کی گہری تہ میں کھینچ لے جاتی ہیں تو

”أَنَا الْحَقُّ“ (میں خدا ہوں) اور کَبَسِ فِي جَنَّتِي سِوَى اللَّهِ (میرے

پہلو میں اللہ کے سوا کچھ نہیں) کہتا ہے۔ خبردار! اس معاملہ پر تعجب

نہ کرنا اور انکار سے نہ پیش آنا جبکہ وادی مقدس کی آگ سے آواز

إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ صادر ہوئی تو پھر اشرف موجودات

(یعنی انسان) جو حضرت ذات سبحانہ تعالیٰ کا نمونہ ہے اگر ”أَنَا الْحَقُّ“

کی آواز صادر ہو تو کوئی تعجب کا مقام نہیں، (صراط مستقیم صفحہ ۱۲)۔

یہی ہمہ اوست کا مقام ہے۔ ہمہ اوست عقیدہ نہیں، حالت ہے، سالک کا شاہدہ

ہے مقام فنا ہے جو عارف کو پیش آتا ہے، یہ حالت سُکر (بیہوشی) ہے، جب ہوش

آتا ہے جس کو ”صحو“ کہتے ہیں تو سالک، خالق اور بندہ کو الگ الگ دیکھتا ہے۔ یہی

مقام ”بقا“ کہلاتا ہے۔ حضرت مجدد و حدت شہودی کا عقیدہ رکھتے تھے وہ فرماتے ہیں

منصور نے جو ”أَنَا الْحَقُّ“ کہا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں خدا ہوں، بلکہ ان کا منشاء

دراصل یہ تھا کہ ”مَنْ يَسْتَمِدُّ مَوْجُودًا فَقَدْ حَقَّ حَقُّهُ“ یعنی میں نہیں ہوں حق ہی حق ہے، حق ہی موجود

ہے، میری حقیقت عدم ہے۔ حق وجود ہی وجود ہے۔ اس اجمال کی

تفصیل یہ ہے کہ خالق اور بندہ میں ایسی نسبت نہیں کہ جو بڑھتی اور تخت میں ہوتی ہے بلکہ پیدا کرنے کے بعد اللہ بندہ سے قریب رہتا ہے مگر دونوں ایک نہیں ہو سکتے، نہ اللہ بندہ میں یا کسی شے میں حلول کرتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ذات کا شہود بغیر صفات کے ممکن نہیں، ذات حق سبحانہ صفات سے ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔

تخلیق، نام ہے حق تعالیٰ کی معلومات یا اعیان کا خارج میں انکشاف "شیخ محی الدین ابن العربی" "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے عالم کو نہایت استوار اور مضبوط پیدا کیا ہے۔ انسان مجموعہ عالم ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کا جو علم ہے وہ اپنی ذات ہی کا تو علم ہے، کیونکہ وجود اس کے اور اس کے فعل کے سوا کسی کا نہیں۔ پس ضروری ہے کہ آدم اس کی صورت پر ہو۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی عین ثابتہ پر کی تو یہ عین اس کا مجلی یا تجلی گاہ بن گیا، پس عالم جمال اللہ ہے اور اللہ اپنے ہی جمال کا محبت ہے، اب جو بھی عالم کو اس نظر سے محبوب رکھتا ہے وہ جمال حق اور صورت جمال ہی کو محبوب رکھتا ہے۔"

صوفیاء کے نزدیک بندہ کی ذات و صفات، حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا ظل ہیں، بندہ کی صفات محض اعتباری و مجازی ہیں۔ شیخ اکبر (شیخ محی الدین) فرماتے ہیں "وَجُودٌ دُنَا بَدَنِهِ وَظُهُورُهُ بِنَا هِمَارِا وَجُودِ اس کی ذات پاک کی وجہ سے ہے اور اس کی ذات کا ظہور ہم سے ہے۔"

ان سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ خالق اور بندہ کی نسبت بڑھتی اور تخت کی نہیں بلکہ بہت گہری ہے۔ مگر یہاں پھر یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ اصل اور ظل دونوں ایک ہیں، جیسا کہ افلاطون کا خیال ہے۔ لہذا اس خیال کو دور کرنے کے لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں "بندہ کتنی ہی ترقی کرے بندہ ہی رہے گا اور اللہ کتنا ہی نزول کرے اللہ ہی رہے گا۔"



”ہمہ اوست“ کے عقیدے کو پیش نظر رکھ کر اور نہ سمجھ کر صوفیائے خام یوں کہنے لگتے ہیں  
 ”خود کوزہ و خود کوزہ گر، خود ہی سودا خود ہی خریدار، خود ہی بیمار خود ہی تیمار دار، سب بیمار  
 کا جلوہ ہے“۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یہ سب  
 بہ اعتبار مشاہدہ سالک کے ہونا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔ اللہ اور مخلوق میں  
 حقیقتاً غیریت ہے عینیت نہیں۔ عینیت عقیدہ نہیں، حال ہے منصور نے جلوہ  
 کی تاب نہ لاکر ”أَنَا الْحَقُّ“ کا لغزہ لگایا۔ اسی نکتہ کو غالب کس لطیف انداز میں  
 پیش کرتے ہیں یہ

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دیرا لیکن ہم کو تقلید تنگ طرفی منصور نہیں  
 حق حقیقت میں موجود ہے اور بندہ (یا مخلوق) حقیقت میں معدوم ہے، دونوں  
 میں غیریت ہے۔ دراصل حق تعالیٰ ذاتی طور پر مخلوق سے قریب ہے۔ جو صوفیاء  
 یہ کہتے ہیں کہ علمی حیثیت سے قریب ہے ان کا مقصود بھی یہی ہے کہ ذاتی طور پر قریب  
 ہے کیونکہ جہاں علم ہے وہیں ذات ہے۔ جن فلاسفروں نے یہ کہا ہے کہ خدا نہ عالم سے  
 متصل ہے نہ منفصل اس سے یہی نکتہ مراد ہے۔

دراصل محبت، ”عالم“ کی تخلیق کا سبب ہے، جیسا کہ گنت گنرا محقیبا  
 کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ جب عارف کو ہر جگہ خدا نظر آنے لگتا ہے اور وہ اپنی ہستی بھی  
 فراموش کر دیتا ہے اس حالت کو ”فنا“ کہتے ہیں اور جب پھر وہ ہوش میں آتا ہے اور رفاق  
 و مخلوق کو الگ الگ محسوس کرنے لگتا ہے اس کو ”بقا“ کہتے ہیں۔ بقا کا درجہ فنا کے بعد ہے۔  
 فنا، راہ ہے منزل نہیں۔ اسی لئے عراقی فرماتے ہیں یہ

ترا از دوست بگویم حکایت بے پوست ہمہ از دوست، و گرنیک بگری ہمہ اوست  
 یعنی اب میں تجھ سے دوست کی بات کھول کر بیان کر دوں، سب کچھ اسی کا پر تو ہے

اور اسی کی تخلیق ہے اور تو میری آنکھ سے (یعنی جیسی میری حالت ہے اُس حالت میں)  
 دیکھے سب کچھ وہی ہے، دیکھے یہ عراقی کا مشاہدہ ہے مگر حقیقت نہیں کیونکہ انبیائے  
 کرام نے انسانوں کو اس کی دعوت نہیں دی۔ یہ محض حال ہے اور حال کوئی کمال نہیں |

# عشق

یارب ز جنوں طرح غمے، و ز نظر یز  
صد بادبہ و ز قالب دیوار و درم یز  
ہر خون کہ عبت گرم شود، و درم افکن  
ہر برق کہ بے صرفہ جہد، بر اثرم یز

یارب مجھے عشق کا جنون عطا کر، میری جو نگاہ اٹھے وہ ہر جگہ یار کا جلوہ دیکھنے لگی۔  
عشق سے مجھے اس قدر سرتار کر کہ نہ صرف دل میں بلکہ تن بدن میں تو سیلابوں کی  
وحشت سما جائے۔ میرے دل میں تیرے عشق کا گرم خون دوڑنے لگے، میری روح  
اور میرے اشعار میں بجلی کا اثر پیدا کر دے۔“

ایسا ہی ایک اور شعر اسی جذبہ سے سرتار ہو کر کہا ہے۔

شیدہ کہ در آتش نہ سوخت ابراہیمؑ بہ میں کہ بے شر و شعلہ می تو انم سوخت  
یوں تو محبت اور عشق ایک ہی چیز ہے، لیکن امام غزالیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ عشق محبت  
کا آخری درجہ ہے۔ یعنی جب محبت میں محبوب کی طلب میں بیقراری آجائے، اس کے  
دیکھے بغیر چین نہ آئے، دل میں سوز پیدا ہو، آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگیں اس  
کو عشق کہتے ہیں، اسی لئے ہم نے عشق کا باب الگ رکھا ہے۔ محبت میں شدت پیدا  
ہو جائے اسی کو عشق کہتے ہیں۔ قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے وَالَّذِينَ  
آمَنُوا آمَنُوا بِاللَّهِ یعنی بعض مومن ایسے بھی ہیں جن میں حق سبحانہ کی محبت  
شدید ہے۔“ عشق کے متعلق بزرگوں کے مختلف اور دل چسپ اقوال ہیں جو نہ صرف

پڑھنے بلکہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں سے

شمعِ فاتحہ از خلق نہ داریم نیاز عشقِ من در پسِ من فاتحہ خواہم باقیست  
مجھے مرنے کے بعد کسی کے فاتحہ پڑھنے کی تمنا نہیں ہے، کیونکہ میرا عشق الہی مجھ پر فاتحہ  
پڑھنے کے لئے کافی ہے۔

دائے راز اقبال کہتے ہیں سے

عشق سکون و ثبات، عشق حیات و حیات علم بے پیدا سوال، عشق ہے یہاں جواب  
ایک صوفی کامل نے فرمایا ہے لَا شَيْخَ أَيْلَعُ مِنَ الْعَشِقِ (عشق سے  
زیادہ محبوب حقیقی کی بارگاہ میں پہنچانے والا کوئی شیخ کامل نہیں ہوگا) (رموز عشق)  
خواجہ گیسو دراز فرماتے ہیں ”عشق وہی صرف است و بخشے خاصہ است“  
یعنی عشق وہی عنایت ہے بغیر طلب ملتی ہے گویا خاص بخشش ہے۔ (اسماء الاسرار)  
حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں ”عشق ایک الفتِ رحمانی اور اہامِ شوق ہے  
جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح پر واجب کیا ہے“ (رموز عشق)

کسی نے حضرت مخدوم شیخ شرف الدین بھٹی امیری سے پوچھا ”عشق کیا چیز ہے؟“  
جواب دیا ”عشق فرطِ محبت است“

در اصل انسان کے پیدا کرنے کا مقصد عشق و محبت ہی ہے، خود کائنات بالخصوص  
انسان محبت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اس سے پہلے ایک حدیثِ قدسی آپ پڑھ چکے  
ہیں جس میں فرمایا گیا ہے ”میں ایک مخفی خزانہ تھا مجھے اس بات سے محبت ہوئی کہ میں  
پہچانا جاؤں لہذا میں نے خلقت پیدا کر دی ہے“

انسان میں عشق سے بہتر کوئی حالت نہیں جس کو حق سبحانہ سے عشق ہوتا ہے وہ

اپنے آپ سے بھی محبت کرنے لگتا ہے، کسی حسین کو دیکھتا ہے اس سے بھی عشق کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک عارف کا قول ہے **الدَّجَازُ قَنْطَرَةٌ الْحَقِيقَةُ مَجَازُ حَقِيقَتِ** کا پل ہے یعنی مجاز سے حقیقت کی طرف راہ کھلتی ہے۔ بعض صوفیاء کو عورت سے محبت ہوتی ہے کیونکہ وہ عشق حقیقی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ایک رمز ہے جس کو عاشق ہی خوب جانتے ہیں، کسی عارف نے کہا ہے

میانِ عاشق و معشوق رمزیت کراما کا تبیں را ہم خبر نیست  
عاشق و معشوق کے مابین ایک رمز ہوتا ہے جس کی کراما کا تبیں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

عشق حقیقی میں ایک قسم کا سوز ہوتا ہے، عاشق کو اللہ سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اس کا نام پاک لے کر یا سن کر ہی رونے لگتا ہے۔ بعض ایسے عاشق بھی ہوتے ہیں جو اللہ کا نام سن کر ترپنے لگتے ہیں۔ بیابا ہو جاتے ہیں۔ اس راز کو شاہ ولی اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "ہمات" صفحہ ۵۸ و ۵۹ پر لکھتے ہیں :-

(ترجمہ) بندہ مومن جس کا اعتقاد یہ ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہیں، اپنے کمال کو اپنی کیا د، یاد کر پر موقوف رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق تعالیٰ کے نام کو یاد کرتا رہتا ہے اور ان کی نعمتوں کو عنایتوں کو ملاحظہ کرتا رہتا ہے، اس حالت پر مدامت کی وجہ سے اس کے دل میں بقراری، اضطراب اور قلق و جوش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ حق تعالیٰ کا نام مبارک زبان پر نہیں لا سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روح جسم سے پرواز کر جائیگی غرض نفس میں جب یہ کیفیت ممکن ہو جاتی ہے اور روز بروز ترقی

کرتی جاتی ہے اور جو ہر قلب میں اتر جاتی ہے اور نفسِ ناطقہ پر اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو اس کو "نسبتِ عشق" سے تعبیر کرتے ہیں، کاملین اہل فنا و بقا کے نزدیک اس نسبت کا ایک ظاہر ہونا ہے اور ایک باطن۔ اس کا ظاہر تو روح میں ایک کیفیتِ مستقرہ ہے دوسری کیفیتِ نفسانیہ کی طرح، اور اس کا باطن محبتِ ذاتیہ ہے، جس کا حامل نفس مجرود ہونا ہے بلکہ یہ روح کے موجود ہونے سے پیشتر پیدا ہو چکی ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ مٹی اور پانی کا جانبِ اسفل میلان ہوتا ہے، اسی طرح آگ کو فوق (اوپر) کی طرف طیران ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے واسطے خواہ وہ محسوس ہو یا معقول، ایک اصل اور کمال ہوتا ہے، جس کی یہ مشتاق ہوتی ہے اور جب تک اس کو پا نہیں لیتی بیتاب اور بیقرار رہتی ہے اور جب پا لیتی ہے تو اُلقت و اُنس محسوس کرتی ہے، اسی طرح کثرت کو بھی اپنی اصل وحدت کی طرف میلان و طیران ہے اور منظر کو اپنے ظاہر کے ساتھ ایک خاص ارتباط ہے جو اس کی اصل جبلت میں مرکوز ہے یہاں نہ کسی خاص حالت یا نعمت کا حصول مقصود ہے اور نہ یہ امر عنایتوں اور نعمتوں کی یاد پر موقوف ہے اس کو "محبتِ ذاتیہ" کہتے ہیں۔ جب روح کی کیفیتِ مستقرہ کا (جس کا اوپر مذکور ہوا) محبتِ ذاتیہ کے ساتھ اتصال ہوتا ہے تو وہ ایک ایسی مرکب حقیقت بن جاتی ہے کہ اس کا جسم تو کیفیتِ روحانی ہوتی ہے اور اس کی روح محبتِ ذاتیہ ہوتی ہے اور جس شخص میں یہ پائی جاتی ہے وہ اُن دونوں میں

ذاتیہ ہوتی ہے اور جس شخص میں یہ پائی جاتی ہے وہ اُن دونوں میں

فرق نہیں کر سکتا۔ ہماری اس تحقیق سے صوفیاء کے دو مختلف اقوال میں تطبیق ہو سکتی ہے، بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ قلق و اضطراب ایک قسم کا عذاب ہے اور جس کو محبوب کا وصال حاصل ہو وہ اس عذاب میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے؟۔ اور بعض کا قول ہے کہ عشق اور قلق کسی وقت بھی سالک سے مرتفع نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ظاہر ہے کہ گروہ اول کی مراد قلق اور اضطراب روحانی ہے، یعنی وہ کیفیت جو روح میں مرتسم ہے۔ اور گروہ ثانی کی مراد ”محبت ذاتیہ“ ہے۔ لیکن عارفین میں یہ دونوں کیفیتیں ملی جلی ہوتی ہیں اس لئے تعبیر و تعین میں مراد، ظاہر و متحقق نہیں ہو سکتی۔

یہاں دو نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اول تو یہ کہ اگر کسی عارف میں محبت ذاتیہ کمزور ہو جائے تو یہ اس کے حق میں موجب نقصان ہے۔ گو اس کو تمام اشیاء میں سراپان محبوب کا مشاہدہ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ دوسرا یہ کہ دنیا و آخرت میں تجرید اور اہل و عیال سے بے فکر ہو جانا، باوجود استقامت اور وفور عقل کے اور بغیر اس کیفیت ذاتی کے ممکن نہیں۔ اس نسبت کے حامل کو ماسومی پر تسلط حاصل ہو جاتا ہے اور اس سے اعراض کرتا ہے، اس لئے جو شخص بھی اس کو دیکھتا ہے اس کے سامنے فروتنی اختیار کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے یہ خیال ظاہر فرمایا ہے :-

”لیکن اس مقام میں ایک نہایت باریک نکتہ ہے جس سے اہل زمان غافل اور چوکے ہوئے ہیں، اور وہ نکتہ یہ ہے کہ محبت نفسانی

جس کو دوسرے لفظوں میں "لقب عشق" سے نامزد کرتے ہیں اور "حُبِ ایمانی" جو "حُبِ عقلی" سے مشہور ہے ان دونوں کے درمیان فرق کیا جائے کیونکہ پہلی حُبِ ساری سلوک کے واردات سے ہے اور دوسری حُبِ انبیاء کرام کے کمالات اور اولیاء عظام کے مقامات میں سے ہے، کیونکہ عوام صوفیاء قسم اول کو دوسری کی جگہ رکھ کر اور اسی کو اشارتِ شرعیہ کا اشارہ ایسے سمجھ کر انبیاء اور اولیاء کی سیر کو اہل عشق اور وجد کے احوال سے تطبیق دینے میں ناخق کی دردسری اٹھاتے ہیں۔

(صراطِ مستقیم صفحہ ۱۲)۔۔

مولانا نے دونوں مجتہدوں پر طویل بحث کی ہے اور خوب سمجھایا ہے۔ ان کے ارشادات کا لب لباب یہ ہے کہ "حُبِ ایمانی اور حُبِ عقلی انبیاء کے کمالات سے پہلے اور "حُبِ نفسانی" حُبِ عشقی ہے اس میں حال وجد، بیقراری اور بیتابی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو حال نہیں آتی، عالمِ علوی کے بڑے بڑے نظارے دیکھ کر بھی خاموش رہتے ہیں اور برداشت کرتے ہیں۔ منصورؒ کو حُبِ عشقی سے حصہ ملا تھا اسی لئے "اَنَا الْحَقُّ" کا نعرہ لگا بیٹھے۔ اسی لئے شاہ عبدالحقؒ رد و لوی نے فرمایا ہے "منصورؒ بچہ بود کہ بیک جرعه تاب نیاورد" منصور ایک بچہ تھا کہ معرفت کے ایک گھونٹ کی تاب نہ لاسکا۔

ایک عارف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں خوب شعر کہا ہے

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک پر تو صفات تو عین ذات می نگری در تبشسی  
یعنی موسیٰؑ نے صرف تجلی صفات دیکھی تھی مگر بے ہوش ہو گئے، اور آپ کے ظرف اور قوت برداشت کا یہ عالم ہے کہ آپ ذاتِ حق کا دیدار کرتے ہیں اور تبسم فرماتے ہیں "یہی محبتِ ذاتیہ" یا "حُبِ ایمانی" یا "حُبِ عقلی" کہلاتی ہے اس میں اضطراب نہیں ہوتا۔



جبکہ حُبِ نَفْسَانِی اور حُبِ عَشَقِی میں اضطراب اور بیتابی ہوتی ہے۔ وجد طاری ہوتا ہے جیسا کہ سماع سے ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مشہور صحابی کی ایک مناجات کا شعر ملاحظہ کیجئے،

حق سبحانہ کی طرف سے فرماتے ہیں یہ

أَنَا الْمَوْجُودُ فَاطْلُبْنِي تَجِدْنِي      فَإِنْ تَطَلَبْتِ سِوَايَ كَمْ تَجِدْنِي

یعنی میں موجود ہوں جب تو نے مجھے طلب کیا، پایا۔ اگر تو نے میرے سوا کسی اور

کو طلب کیا، تو مجھے نہیں پائے گا۔

ذات پاک حق سبحانہ کا خاصہ یہ ہے کہ جب بھی اس کا خیال کرو وہ موجود ہے۔ اس

کی وجہ یہ ہے کہ ذات حق ہر جگہ موجود ہے، چونکہ انسان کو غفلت ہو جاتی ہے دنیوی

کاموں میں پھنس جاتا ہے اس لئے استحضار نہیں رہتا۔ مشہور حدیث قدسی (میں اپنے

بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں۔ الخ) کے معنی بھی یہی ہیں کہ اگر بندہ ذات حق کا تصور کرے

تو اس کو موجود پائے گا۔ اس کو یافت اور شہود بھی کہتے ہیں یعنی بندہ بہ اعتبارِ ھُو الظَّاهِر

اس کو دیکھے اور بہ اعتبارِ ھُو الْبَاطِنِ اس کو پائے۔ اس کو صوفیاء کی اصطلاح

میں ”دوام حضور“ کہتے ہیں۔



# عالم مثال !

کے غیبِ غیبِ حسن کو سمجھتے ہیں ہم شہود  
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

عالم مثال جس قدر حقیقت ہے، اتنا ہی حیرت انگیز بھی ہے، اس سے کسی انسان کو گریز نہیں کیونکہ وہ مرتے ہی اس عالم میں ہوتا ہے۔ غالب کا یہ شعر مشکل اشعار میں گنا جاتا ہے۔ دراصل یہ شعر حضرت علیؑ کے اس قول کا ترجمہ ہے ”دنیا میں انسان سو رہے ہیں، جب مر جائیں گے تو بیدار ہو جائیں گے، انسان سوتے ہوئے جب خواب دیکھتا ہے تو اس کو عالم خواب میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے وہ جو کچھ بھی دیکھتا ہے اس کو حقیقت ہی سمجھتا ہے، جب بیدار ہوتا ہے اس وقت کہتا ہے ”میں نے خواب دیکھا تھا“ اسی طرح دنیا میں جو لوگ زندگی گزار رہے ہیں اور کائنات کو دیکھ رہے ہیں یہ گویا ایک خواب ہے، جب مر جائیں گے تب ان کو انتباہ ہوگا کہ ”خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔“ مرنے کے بعد انسان جس عالم میں چلا جاتا ہے اسی کو عالم مثال یا ”عالم برزخ“ اور شریعت اسلامی کی زبان میں ”عالم قبر“ کہتے ہیں۔ سب سے پہلے جس ذہین شخص کے دماغ میں عالم مثال کی بات آئی وہ افلاطون (میدانش سلسلہ

وفات ۶۲۶ء) ہے۔ اس کا قول ہے کہ اشیاء دنیا میں آنے سے پہلے ایک اور عالم میں موجود ہوتی ہیں، (یہ عالم مثال ہے) اور پھر دنیا میں آتی ہیں۔ دنیا میں آنے سے پہلے جو باتیں وجود پذیر نہیں ہوتیں ان کو "تقدیر" بھی کہتے ہیں (تقدیر پر بحث الگ کی گئی ہے)۔ افلاطون خدا کے وجود کا قائل تھا اسی لئے اس کو "افلاطون الہی" کہتے تھے۔ پیدا ہونے سے پہلے انسان جس عالم میں ہوتا ہے اس کو "مثال شرقی" کہتے ہیں، اور مرتے کے بعد جس عالم میں چلا جاتا ہے اس کو "مثال غربی" کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجۃ اللہ البالغہ" میں "باب ذکر عالم مثال" اس طرح شروع کرتے ہیں۔ "اعْلَمْنَا أَنَّهُ أَحَادِيثُ كَثِيرَةٌ عَلَىٰ أَنَّ فِي الْوُجُودِ عَالَمًا غَيْرَ عُنْصُرِيٍّ تَتَمَثَّلُ فِيهِ الْمَعَانِي... الخ۔ عربی عبارت طویل ہے ہم صرف اس کا ترجمہ درج کرتے ہیں :-

"معلوم ہونا چاہیے کہ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس عالم عنصری کے علاوہ اور ایسا عالم موجود ہے جس میں معنوی (مخفی) چیزیں (مثلاً صفات انسانی، عبادات، گناہ وغیرہ) اپنی صفت کے مناسب جسم میں ظہور کرتی ہیں اور زمین میں پائے جانے سے پہلے ہر چیز وہاں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے، پس جب اس دنیا میں پائی جاتی ہے تو ایک طرح سے یہ وہی ہوتی ہے۔ ہم کہہ دیا کرتے ہیں کہ "آسمان سے رحمت نازل ہوئی" یا "مصیبت نازل ہوئی" یہ غلط نہیں کیونکہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ عالم مثال میں ہو کر پھر دنیا میں آتا ہے۔ رسول پاکؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "میں آسمان سے فتنے نازل ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں"

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں :-

” لوگ آپس میں لڑ رہے تھے، میں نے دعا کی، آسمان سے

(عالم مثال سے) ایک نقطہ نورا آیا اور لوگوں میں پھیل گیا وہ پھر

ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔“

اس سلسلہ میں احادیث تو اس قدر ہیں کہ ہم سب کو اس جگہ نقل بھی نہیں کر سکتے  
قیامت کے واقعات (قبروں سے اٹھنے کے بعد) سب عالم مثال میں ہونگے  
مثلاً اللہ کا عرش پر جلوہ افروز ہونا، قرآن، حج، نماز، روزہ کا مناسب شکلوں  
میں آنا، موت کو مینڈھے کی شکل میں ذبح کرنا، دنیا کا بڑھتی ہوئی بد شکل عورت کی  
شکل میں قیامت میں آنا، قبر میں فرشتوں کا سوال کرنا، کافر کو نالوفیہ <sup>۹۹</sup> سانپوں  
کا کاٹنا، مومن کو عالم قبر میں جنت نظر آنا، وغیرہ۔

امام غزالیؒ ”کیمیائے سعادت“ میں فرماتے ہیں ”احمق کہا کرتے ہیں کہ ہم تو  
قبروں میں دیکھا کرتے ہیں، وہاں تو ہم کو کوئی سانپ، آگ یا باغ نظر نہیں آتا۔  
اگر یہ چیزیں وہاں ہوتیں تو ہم کو آنکھوں سے نظر آتیں، ان احمقوں کو معلوم ہونا  
چاہیے کہ سانپ، اژدہے یا خور و قصور، سب روح میں مرتسم ہیں، خواہ جسم مٹی  
ہو جائے مگر روح سب کچھ محسوس کر رہی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ جس طرح جاگنے  
والوں کو وہ چیزیں نظر نہیں آتیں جو سونے والے کو خواب میں دکھائی دے رہی ہیں  
جب اس کو محسوس ہو رہی ہیں تو اس کے لئے حقیقت ہی ہیں اور موجود ہیں، جاگنے  
ہونے جو کچھ ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ بھی صرف خیال کی کار فرمائی ہے۔“ امام صاحب  
اپنی کتاب ”مفتون“ میں فرماتے ہیں ”جب روح، جسم سے الگ ہو جاتی ہے  
تو روح کے ساتھ قوت و ہمبہ باقی رہ جاتی ہے، اس وقت مرنے والے کو

قوت و ہمیبہ کی وجہ سے عذاب یا لذت مختلف مناسب شکلوں میں محسوس ہوتی رہتی ہے  
 شاہ ولی اللہ صاحب کا تصور یہ ہے کہ رُو حیں دو ہیں۔ ایک رُو حِ انسانی  
 یا نفسِ ناطقہ، دوسری رُو حِ ہوائی یا "نسمہ"۔ جب انسان مرتا ہے تو جسمِ ارضی  
 کے چھوٹ جانے سے اس کے نفسِ ناطقہ کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ وہ "نسمہ" کے ساتھ  
 جڑا رہتا ہے یا شاہ صاحب کے الفاظ میں "رُو حِ انسانی" "نسمہ" پر سوار رہتی  
 ہے۔ اس طرح انسان عالمِ برزخ یا عالمِ مثال یا عالمِ قبر میں مُتَلَدِّد یا مُتَنَالِم ہوتا  
 رہتا ہے، اسی راز کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے  
 فرشتہ موت کا چھوٹنا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے  
 یہ سب احساس کی کار فرمائی ہے۔ اور بہ قول برکلی جو چیز محسوس ہوتی ہے  
 وہ حقیقتاً موجود ہوتی ہے۔ جس طرح خواب دیکھنے والا شاہد کرتا ہے اور محسوس  
 بھی کرتا ہے اور دوسرا آدمی خواہ اُس سے لپٹا ہوا ہو کچھ بھی محسوس نہیں کرتا، مگر  
 جس کو محسوس ہو رہا ہے اُس کے لئے یقیناً موجود ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ عالمِ مثال میں خیالی صورتیں ایسی نظر آتی ہیں جیسی  
 کہ اہل ریاضت کو نظر آتی ہیں، اگر ان کے اعمالِ مَلکیّہ ہوتے ہیں تو ان کو حسین و  
 جمیل صورتوں میں دکھایا جاتا ہے وہ ان سے نہایت عمدہ طرز سے گفتگو کرتے ہیں  
 ان کے لئے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس میں سے اس کی خوشبوئیں آنے  
 لگتی ہیں۔ اگر اعمالِ بد کئے ہوتے ہیں تو ان کو اعمال کی نادرستی کا علم ایسے بد شکل  
 فرشتوں کی شکل میں نظر آتا ہے جن کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور وہ سخت لہجے میں  
 ہمیت ناک باتیں کرتے ہیں۔ جس طرح غصہ کو درندے کی صورت میں اور بزدلی  
 و نامردی کو شرکوش کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ عالمِ مثال میں

انسانی رُوحوں کا ایک مُرجح اور مقام خاص ہے جس کی طرف یہ رُوحیں اس طرح کھینچتی ہیں جیسے مقناطیس کی طرف لوہا کھینچتا ہے۔

خالق نے کمال یہ کیا ہے کہ رُوح انسانی میں اعمال کی رُوحیں مُرْتَمِّم ہو جاتی ہیں جو کبھی اس سے نہیں نکلتیں۔ انسان جب سو جاتا ہے تو اعمال کی رُوحیں ہی مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں، بلکہ انسان جو عمل کرتا رہے گا اس کی رُوح بیداری میں بھی مختلف حالتوں میں اس کے سامنے آتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ اگر انسان کو کسی سے حسد ہے تو جلن سارے دن محسوس ہوتی ہے اور مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے مشہور مثل ہے "ازماست کہ برماست" جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے وہ سب ہمارے عمل ہی کا خبیازہ ہے۔ حق سبحانہ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَكُلُّ الْإِنْسَانِ أَلْرَّمْتَاةٌ  
طَائِرَةٌ فِي عُنُقِهِم  
ہم نے ہر انسان کے عمل کو اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے۔

یہ عرب کا محاورہ ہے یعنی جیسا کیا ہے ضرور بھرے گا۔ عمل کی رُوح اس میں سما چکی ہے۔ ایک حدیث ہے کہ خدائے تعالیٰ قیامت میں فرمائے گا "یہ تمہارے ہی اعمال تو ہیں جن کو میں نے تمہارے لئے بیعت کر محفوظ رکھ لیا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں "نفس ناطقہ (روح) اعمال کا مبداء و منبج ہے وہ اسی سے نکل کر اسی کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں پھر اسی کے دامن سے چمٹ جاتے ہیں اور بیعت کر اُس میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ اس موقع پر شاہ صاحب نے اچھے اور بُرے اعمال کے اثرات کی خوب مثال دی ہے انھوں نے کہا ہے کہ ہر درد و بیخ اور لذت و خوشی کی ایک خاص صورت و شکل ہوتی ہے جس میں وہ مُتَشَكَّل ہو کر دکھائی دیتی ہے، مثلاً خلط مُحْرَق سے بدن میں خراش اور چھین ہوتی ہے۔ جس کو صفرا ہے اس کو

خواب میں اکثر آگ اور شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ بلغمی مزاج والے کو خواب میں برف پانی وغیرہ دکھائی دیتا ہے۔ جس شخص میں قوتِ ملکیہ کا غلبہ ہوتا ہے اس کو خواب یا بیداری میں انس و سرور کی مختلف صورتیں (جنت، حور و قصور) نظر آتی ہیں۔

عالم مثال کی جو حالت ہے اور اس پر آج کل کے فلاسفر جو اعتراض کر سکتے ہیں امام غزالیؒ نے اس کی ایسی وضاحت کی ہے کہ اس زمانہ میں بھی اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ ان کی یہ عبارت ہم نے "حجۃ اللہ الباقیہ" سے نقل کی ہے۔

غزالی "احیاء العلوم الدین" میں فرماتے ہیں :- اس قسم کی (عالم مثال کے

متعلق) احادیث کے ظاہری معنی تو صحیح ہیں لیکن ان کے اسرار اور بھید مخفی ہیں۔ البتہ اہل بصیرت پر سب بالکل واضح ہیں، لہذا جن کو

ان کے اسرار معلوم نہ ہوں اور اصل حقیقت کا علم نہ ہو تو انھیں

ان کے ظاہری معنوں کا انکار نہیں کرنا چاہیے بلکہ سچا جان کر تسلیم کر لینا

چاہیے کیونکہ یہی ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ ہم

نے کافر کی قبر کو بارہا کھول کر دیکھا اور عرصہ تک اس کی لاش کو بھی قبر

میں پڑے دیکھا، لیکن یہ چیزیں ہم نے کبھی نہیں دیکھیں تو پھر خلاف

مشاہدہ چیز کی کیسے تصدیق کی جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان

کی ایسی باتوں کے تصدیق کرنے کے تین حال ہیں :-

پہلا حال جو سب سے زیادہ واضح، صحیح اور قابل تسلیم ہے وہ

یہ ہے کہ یہ سب باتیں اپنی جگہ موجود ہیں، بیشک اس کو سنا ہے

اور اڑو ہاڑو رہا ہے لیکن تجھ کو ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا

کیونکہ ملکوتی امور کے دیکھنے کی ان آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں

اور جو چیز بھی آخرت سے تعلق رکھتی ہے وہ ملکوتی ہے۔ دیکھئے صحابہؓ  
 نزولِ جبرئیلؑ پر کس طرح سے ایمان رکھتے تھے حالانکہ وہ ان کو دیکھتے  
 نہ تھے اور ان کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ آنحضرتؐ جبرئیلؑ کو دیکھا  
 کرتے ہیں، پس اگر تم کو اس بات پر ایمان نہیں تو تمہارا ملائکہ اور  
 وحی پر بھی صحیح طور پر ایمان لانا بڑا مشکل ہے (لہذا پہلے اس کی تجدید  
 و تصحیح ضروری ہے) اور اگر تم کو ایمان ہے اور تمہارے نزدیک ممکن ہے  
 کہ ایک چیز اُمت کو نظر نہ آئے لیکن آنحضرتؐ کو دکھائی دے تو پھر  
 میت کی بابت اس کے تسلیم کرنے میں تم کو کیوں تردد ہے اور جس  
 طرح فرشتے، آدمی اور حیوانات کے مشابہ نہیں اسی طرح وہ سانپ  
 اور بچھو جو میت کو ڈستے ہیں ہمارے عالم عنصری کے سانپ اور  
 بچھوؤں کی طرح نہیں بلکہ وہ کسی اور جنس کے ہیں اور کسی اور قسم کی  
 قوتِ حس سے ادراک میں آسکتے ہیں۔

دوسرا حال یہ ہے کہ سونے والے کی حالت تو تم کو یاد ہوگی کہ وہ  
 خواب میں سانپ کو ڈستے دیکھتا ہے اور اس کی تکلیف اور ایذا بھی  
 اس کو محسوس ہوتی ہے جس طرح جاگتے کو محسوس ہوتی ہے یہاں تک  
 کہ تم اس کو پیچھتے ہوئے اور پسینہ ماتھے پر آتے ہوئے دیکھتے ہو  
 اور کبھی وہ اپنی جگہ سے اچھل بھی پڑتا ہے یہ سب باتیں وہی دیکھتا اور  
 محسوس کرتا ہے لیکن ظاہر میں تم اس کو وہیں پڑا دیکھتے ہو، نہ اس  
 کے گرد سانپ دکھائی دیتے ہیں نہ بچھو، حالانکہ اس کے لحاظ سے سانپ  
 بھی اس کے پاس موجود ہیں اور بچھو بھی اور تکلیف بھی اُسے برابر



محسوس ہو رہی ہے لیکن یہ سب باتیں تمہارے لحاظ سے مشاہدہ سے  
 باہر ہیں اور جب سزا اور عذاب دراصل ڈسنے کی تکلیف سے ہوتا ہے  
 تو پھر خیالی سانپ ہونے یا حقیقی سانپ ہونے سے اس میں کیا فرق پڑتا  
 تیسرا حال یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ سانپ بذات خود کچھ  
 تکلیف و ضرر نہیں دیتا بلکہ جس چیز سے تم کو درد و تکلیف پہنچتی ہے وہ  
 اس کا زہر ہے، پھر زہر بھی بذات خود کچھ باعث تکلیف نہیں بلکہ اس  
 سے جو اثر حاصل ہوتا ہے وہ اصل وہی (باعث) تکلیف ہے۔ تو اگر سو آگے  
 زہر کے چاہے کسی اور چیز سے یہ اثر حاصل ہو تو وہ بھی ایک قسم کی تکلیف و عذاب  
 ہوگا جو اس سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ لیکن اس عذاب کی تکلیف کو بغیر  
 ایسے سبب کی طرف نسبت دینے۔ بیان نہ کر سکو گے جس سے عام طور پر  
 اسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جیسے جماع کی لذت، اگر انسان کو بغیر  
 عورت سے صحبت کئے حاصل ہو جائے تو وہ اس کی تعریف مباشرت کی طرف  
 نسبت دینے بغیر نہیں کر سکتا، اور یہ نسبت محض سبب (کے اثر) کی تعریف  
 کے لئے کرتے ہیں اور اس لئے کہ سبب کا ثمرہ حاصل و معلوم ہو جائے، گو  
 سبب کی صورت حاصل نہ ہو۔ اور سبب بیان کرنے سے اس کا ثمرہ  
 بتانا مقصود ہوتا ہے، اور بذات خود بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا۔

پا درہے کہ امام غزالی بہت بڑے فلاسفر بھی تھے اور مسلم صوفی بھی، عالم مثال یا  
 عالم برزخ کے جو تین احوال بیان کئے ہیں وہ مخالف کو جواب دینے کے لئے ہیں ورنہ  
 حق وہی ہے جو اول بیان کیا گیا ہے یعنی سب چیزیں ملکوتی ہیں، اس عالم  
 عنقریب میں، عنقریب آنکھوں سے نظر نہیں آسکتیں۔ مرنے کے بعد انسان جس

عالم میں پہنچتا ہے وہ ملکوتی ہے اور وہاں نگاہ بھی ملکوتی ملتی ہے تاہم  
 امام غزالی نے اتنی عمدہ وضاحت کر دی ہے کہ جس سے بہتر ممکن نہیں۔

# تَنْزِيهِ وَتَشْبِيهِ

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ بکتا  
جو دونی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

حق سبحانہ، اپنی ذات میں بے مثل ہیں۔ مرتبہ احدیت میں ان کی ذات پاک کا احاطہ کبھی نہیں ہو سکتا، خواہ جنت ہی کیوں نہ ہو، مرتبہ تنزیہ میں ان کی ذات پاک اتنی مستزہ ہے کہ ذہن اس کو گھیر نہیں سکتا۔ چونکہ انسان مرتبہ تنزیہ میں اس کا ادراک نہیں کر سکتا اس لئے حق سبحانہ نے اپنے کرم سے مرتبہ تشبیہ میں ظاہر ہونے کی عادت کی ہے۔ متعدد آیات قرآنی و احادیث تشبیہ کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہم چونکہ ”ظاہر و باطن“ کے عنوان سے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈال چکے ہیں، لہذا دوسرے پہلو سے اس پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

ذات پاک ظہور کو چاہتی ہے، کیونکہ اگر وہ ہمیشہ ہی مرتبہ تنزیہ میں رہے تو انسان کا دماغ اس کے ماننے بلکہ جاننے سے انکار کر سکتا ہے، چونکہ ان کا صفاتی نام ”باطن“ بھی ہے اور ”ظاہر“ بھی، لہذا انسان کی استعداد کے لحاظ سے وہ تنزیہ اور تشبیہ کے جامع ہیں، یعنی ”منزہ“ ہیں عین تشبیہ میں اور مشبہ ہیں عین تنزیہ میں۔“

”اشعریہ“ فلسفیوں کا ایک گروہ ہے، وہ حق تعالیٰ کو اس قدر مستزہ مانتا

ہے کہ تشبیہ کا قائل نہیں۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ قیامت میں اور جنت میں حق سبحانہ کا دیدار نہیں ہوگا کیونکہ وہ عام انسانوں اور دیگر اشیاء کی طرح نظر نہیں آسکتے۔ ان کی نظروں سے تشبیہ کی آیات و احادیث اوجھل ہو گئی ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں میں ایک فرقہ "مشبہ" پیدا ہوا ہے جو اللہ سبحانہ کی شکل و صورت بلکہ جسم کا بھی قائل ہے۔ ایک حدیث ہے کہ "جب نہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ پہلے آسمان پر آجاتا ہے۔ الخ"۔ مشبہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم بذات خود آتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ توجہ اور رحمت کا نزول مراد ہے۔ غرض اختلاف کی وجہ محض یہ ہے کہ ایک فرقہ کی نظر سے دوسری آیات و احادیث پوشیدہ ہو گئی ہیں اور یہی انکار کا سبب بنتا ہے۔

اب غالب کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مرتبہ احدیت میں حق سبحانہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اس مرتبہ میں دوئی نہیں ہو الظاہر کا اقرار بغیر ہوا الباطن کے اقرار کے ناممکن ہے۔ شیخ محی الدین ابن العربی نے خوب فرمایا ہے :-

"اگر تو تنزیہ محض کا قائل ہوگا تو حق سبحانہ کی ذات "غیب"

میں مقید ہو جائے گی اور ہو الظاہر کا انکار لازم آئے گا

اور اگر تو صرف تشبیہ کا قائل ہوگا تو حق تعالیٰ کو محدود کرنے

والوں میں سے ہوگا۔ لیکن اگر تو دونوں امر کا قائل ہو اور

حق تعالیٰ کو متترہ عین تشبیہ میں اور مشبہ عین تنزیہ میں جانچا

تو راہ راست کا چلنے والا اور معارف الہیہ کا امام اور سردار

ہوگا۔ (قرآن اور رضوت صفحہ ۸۷)

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ حق تعالیٰ کے کسی صورت میں ظاہر ہونے

سے ان کی ذات پاک متاثر نہیں ہوتی، وہ جیسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ خواب میں حق سبحانہ کو دیکھنا جائز ہے، اکثر انبیاء اور اولیاء نے دیکھا ہے مگر کسی تشبیہی شکل میں ہی دیکھا ہے۔ حضرت موسیٰ کو درخت پر جو تجلی نظر آئی وہ تشبیہی تھی۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ مومنین کو تشبیہی شکل میں دیدار دکھائیں گے۔ یَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقِ اِسَى وَاقْعَهٗ كِى طَرَفِ اِشْرَاهِ۔

اگرچہ حق سبحانہ کا کوئی مثل نہیں لیکن مثال ہے۔ قیامت میں حق سبحانہ عرش پر تجلی فرمائیں گے ایک طرف جنت ہوگی دوسری طرف دوزخ۔ یہ تجلی تشبیہی ہوگی اس کا کچھ اشارہ ”عالم مثال“ کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے اس کو بھی دیکھئے۔

صوفیاء کے نزدیک تخلیق تجلی ہے، تمثیل ہے، ظہور ہے۔ خدائے قدوس مرتبہ ذات میں منترہ ہیں، مرتبہ صفات میں مشتبہ ہیں۔ جب بھی ظاہر ہونے میں صفات کے پردے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں ”ذات را، جز پردہ ذات نہ تو ال وید“۔ ذات کو ذات کے پردے یعنی صفات میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ طور پر حق سبحانہ کی تجلی نور کی صورت میں ہوئی تھی اور درخت میں نور کی شکل میں۔

تجلی کے معنی یہ ہیں ”ذات پاک کا جیسے کے ویسے رہتے ہوئے صورت تشبیہی سے ظہور کرنا“۔ ذات خداوندی تنزیہیہ میں نظر نہیں آسکتی یہاں اس کی بیکتائی کا ظہور ہے۔ اور مرتبہ تشبیہی میں کسی مناسب صورت میں ہی جلوہ نما ہو سکتی ہے منصور نے ”اننا الحق“ کا لغز یہ احساس کر کے لگایا کہ پردہ صفات میں اسی کا ظہور ہے یہاں تک کہ خود میں بھی۔ انسان بہ یک وقت ایک

ہی بات سوچ سکتا ہے۔ دوسرے اعتبارات اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں جب مشاہدہ قومی ہو جاتا ہے تو سالک ہر شے میں اسی کو دیکھتا ہے لہذا "ہماوت" باعتبار مشاہدہ سالک کے درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔

ذات پاک اور اشیاء میں کئی طور پر غیریت ہے جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک مشہور حدیث ہے کہ حق سبحانہ سب مومنین پر عام تجلی کریں گے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے خاص تجلی ہوگی، امام غزالی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تجلی ان کی استعداد کے مطابق ہوگی۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ ان کے لئے الگ و بدار دکھائیں گے۔ اس کی تفصیل "احیاء العلوم" میں ہے۔ بعض احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق سبحانہ کو مثالی صورت میں دیکھا تھا۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے تو مرتبہ حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ یہ مثالی یا تشبیہی شکل ہی میں دیکھا تھا۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کو تشبیہی شکل میں خواب میں دیکھا۔ دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک کونسی عبادت افضل ہے؟ ارشاد ہوا "قرآن"۔ شریعت میں اللہ تعالیٰ کا تشبیہی شکل میں تجلی فرمانا ثابت ہے۔ اس طور پر تجلی فرمانے سے ذات پاک کے غمی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا حضرت جبریل صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحیہ کلبی (ایک صحابی) کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ مگر اس ظہور سے حقیقت جبریلی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا حضرت عزرائیل ایک ہی وقت میں ہزاروں آدمیوں کی روحوں قبض کرتے ہیں اور مختلف شکلوں میں (انسانوں کی استعداد باطنی کے لحاظ سے) ظہور فرماتے ہیں، مگر حقیقت عزرائیلی جیسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔

حق سبحانہ کا نام ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ یہ صفاتی نام ہے ظہور کے لئے

تشبیہی شکل ہونا ضروری ہے۔ باطن میں استتار لازمی ہے۔ حاملین عرش حق سبحانہ سے بہت قریب ہیں مگر ذات منترہ سے اس قدر قریب نہیں کہ دیکھ سکیں۔ لہذا قرآن کی رو سے وہ بھی ایسا ہی ایمان بالغیب رکھتے ہیں جیسا کہ عام مومنین۔ معراج میں رسول اللہ حق تعالیٰ سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ لوگوں کا گمان یہ ہو گیا تھا کہ آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ”یا رسول اللہ کیا آپ نے معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا؟“ آپ نے جواب دیا ”نور آتی آراء“ (وہ نور ہے میں اس کو کیسے دیکھ سکتا تھا) یہ مقام احدیت ہے، یہاں کوئی نزول نہیں۔ یہ سہوئیت کا مرتبہ ہے یعنی تنزیہ کا، اس مرتبہ میں کوئی بھی حق سبحانہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس مرتبہ میں وہ اس قدر لطیف ہے کہ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ قرآن میں ہے کہ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بلکہ وہ نگاہوں کو دیکھ لیتا ہے۔ غالب نے اسی تصور کو پیش کیا ہے۔

سے اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ بیکتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

✓



# خیر و شر

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی  
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

دُنیا میں بُرائی بھی ہے بھلائی بھی، نور بھی ہے ظلمت بھی، کفر بھی ہے، ایمان بھی، شرار بولہبی بھی ہے نور مصطفوی بھی۔ جن مستشرقین نے اسلام کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں شر ہی شر ہے۔ بلکہ شر اس قدر ہے کہ خدا اور انسان کی ساہا سال کی کوششیں بھی دُنیا سے شر کا خاتمہ نہیں کر سکیں۔ ان فلاسفروں میں اسپنوز، امل، جارج برنارڈشا، ولیم جیمس، شلر، اور نکلسن زیادہ مشہور ہیں۔ یہ فلاسفر جبران ہو کر سوال کرتے ہیں کہ جب خدا قادر مطلق ہے تو شر کو کیوں دُور نہیں کرنا جو نہ اُس کے نزدیک پسندیدہ ہے نہ انسان کے نزدیک۔ اور جب خیر سے خیر ہی صادر ہوتا ہے تو شر دُنیا میں کس طرح پیدا ہو گیا؟۔ زیادہ شبہ اسلام کے اس عقیدے سے بھی ہوا کہ اللہ "خالق خیر و شر" ہے حالانکہ یہ عقیدہ حق ہے۔

صوفیاء کی نظر گہرائی تک پہنچتی ہے۔ غالب کا مذکورہ بالا شعر صاف شہادت دے رہا ہے کہ غالب کو تصوف کا کچھ حصہ ملا ہے۔ دُنیا میں لطافت بے کثافت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آئینہ کے پیچھے زنگ ہونے سے آئینہ کا ایک رخ اتنا



شفاف ہو جاتا ہے کہ اُس میں صورت نظر آنے لگتی ہے اسی طرح چین گو یا باد بہاری کا رنگ ہے جس سے باد بہاری محسوس ہوتی ہے۔ جب مغرب کے فلاسفروں نے دیکھا کہ "شر" دنیا سے دور نہیں ہو سکتا تو وہ قنوطیت پرست بن گئے۔ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ دنیا میں بُرائی، غم اور شر کے سوا کچھ نہیں۔ اور پھر خدا کی قدرت پر بھی شبہ کیا کہ وہ شر کو ناپسند کرنے کے باوجود دور نہیں کر سکتا۔

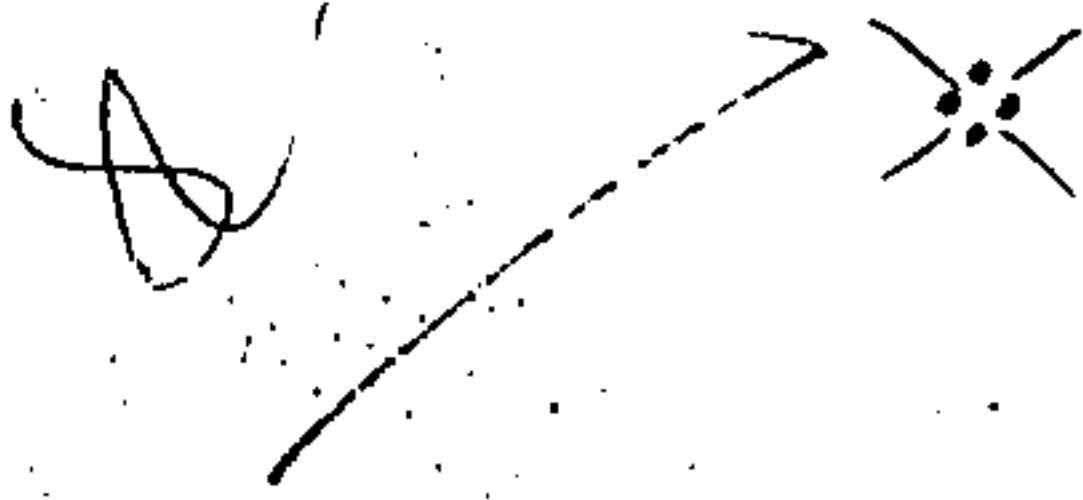
صوفیائے کرام نے اس راز کی گہرائی کو سمجھا ہے اور خوب سمجھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ذاتِ حق سبحانہ سراسر وجود ہے اس کے علاوہ اور اشیاء میں عدمیت ہے، اللہ کا علم قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے، ہر شے ازل سے علم الہی میں ثابت ہے۔ ان معلوماً حق کو صوفیاء "اعیان ثابتہ" کہتے ہیں۔ ان کو "اعدام" اور "معدومات حق" بھی کہتے ہیں۔ ساری صفات ذواتِ خلق سے مسلوب ہیں۔ یوں سمجھو کہ تمام چیزوں کی حقیقت عدم ہے اور عدمِ شر ہے، خداوند کریم کی ذات وجود ہے، وہ سراسر خیر ہے۔ وجودِ مطلق جب اپنا پر تو اعدام پر ڈالتا ہے تو کہیں کچھ کسر رہ جاتی ہے (یعنی اس کے ارادے سے، بلا ارادہ نہیں) جتنا حصہ وجود کا ملا وہاں خیر رہا اور جہاں پر تو نہیں پڑا وہ حصہ "شر" کا رہ گیا۔ مثلاً ایک انسان زیادہ سخی ہے دوسرا اس سے کم، تیسرا اس سے کم، سخاوت خیر ہے۔ انسان کی رُوح میں جتنا حصہ وجود کا آیا وہاں سخاوت ہے اور جو تشنہ رہ گیا وہ بخل ہے، بخل ہی شر ہے بخل، وغیرہ۔ صفات، "صفاتِ عدیہ" کہلاتی ہیں۔ صفاتِ وجودیہ (خیر) کا نہ ہونا، گو یا صفاتِ عدیہ کا پایا جانا ہے یعنی وہاں شر کی صفات پائی جائیں گی۔

اور زیادہ وضاحت کے ساتھ پھر سمجھ لیجئے۔ آفتاب کی روشنی سے نور پیدا ہوتا ہے، درخت یا کسی بلڈرنگ کے حائل ہونے سے سایہ یا ظلمت پیدا ہوتی ہے۔

آفتاب کا کام نور ڈالنا ہے۔ جہاں نور نظر آ رہا ہے وہاں وجود یا خیر ہے، جہاں اندھیرا  
 یا سایہ نظر آ رہا ہے وہاں شر ہے۔ دیکھئے آفتاب کے وجود سے نور و ظلمت  
 دونوں پیدا ہوئے ہیں۔ وجود باری کے پر تو سے (جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے)  
 خیر اور شر دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے اسلام حق سبحانہ کو خالق خیر و شر کہتا  
 ہے۔ کیونکہ اسی کے ارادے اور قدرت کا ملکہ یا حکمت بالغہ سے خیر و شر پیدا ہوئے  
 ہیں۔ اب آپ قرآن کی اس آیت کا مطلب سمجھ جائیں گے کہ ”تَجْهَوْنَ كُوفًا لِّعِبَادِي  
 (خیر) پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے (فَمِنَ اللّٰهِ) اور جو بُرائی (شر)  
 پہنچتی ہے وہ تیرے نفس کی طرف سے ہے (فَمِن نَّفْسِكَ)  
 اسی لئے مولانا جامی فرماتے ہیں کہ

ہر شر عدم بود، و عدم غیر وجود پس شر ہمہ مقتضای غیر است اقول  
 ہر شر عدم ہے اور عدم غیر وجود ہے، لہذا شر، غیر کا مقتضی ہے وجود مطلق کا  
 نہیں۔ شر عدم کا مقتضی ہے جو خداوند سبحانہ کا غیر ہے۔ لہذا جہاں خیر ہے وہ  
 سب وجود حق سبحانہ کا فیض ہے اگرچہ دونوں کا وجود ان کی حکمت کا نتیجہ ہے  
 اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مغربی فلاسفوں کا یہ کہنا کس قدر حماقت ہے  
 کہ خدا شر دور کرنے پر قادر نہیں۔ آپ زیادہ غور کریں گے تو یہ ازعان یقین حاصل  
 ہو جائے گا کہ خیر کے ساتھ شر ضروری ہے۔ خوب کہا ہے کسی نے کہ

در کارخانہ عقل، از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد، اگر بولہب نباشد؟



# قرب و معیت

بر آور دے کلفتِ سمت و سو  
بہ نور السموات والارض رو

مرزا غالب نے قرآن کے فقرے **اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** سے  
فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے معنی ہیں ”اللہ زمین و آسمان کا نور ہے“ بہت فصیح و بلیغ  
فقرہ ہے۔ یوں نہیں فرمایا کہ اس کے نور سے نظر آرہے ہیں“ نہ یوں فرمایا کہ  
خدا کے نور سے پیدا ہوئے ہیں“ نہ یہ اشارہ کیا کہ آسمانوں اور زمین اور ساری  
کائنات سے خالق کا نور ظاہر ہے“ اس آیت کے معنی یہ ہیں ”اللہ آسمانوں اور  
زمین کا نور ہے“ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے۔ ایک اور  
جگہ فرمایا ہے **وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ** (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم  
ہو)۔ قرآن کی اس آیت کی تاویل علمائے ظاہر نے کی ہے۔ انھوں نے کہا ہے ”اس  
سے علمی قرب مراد ہے ذاتی نہیں“ اگر ہم اس کو مان بھی لیں تب بھی قرب ذاتی  
ہی مراد ہوگا۔ کیونکہ علم خدا کی صفت ہے، جہاں صفت ہوگی وہاں ذات کا ہونا  
ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تو ہونہیں سکتا کہ ذات کہیں اور ہے اور صفت کسی اور جگہ ہے  
”قرب و معیت“ صوفیاء کی ایجاد نہیں۔ قرآن و احادیث میں متعدد مقامات  
پر یہ وضاحت کی گئی ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ”فتح الرحمن“ میں  
”**وَهُوَ مَعَكُمْ**“ کے معنی یہ بیان کئے ہیں ”او با شہاست ہر جا کہ باشید“ یعنی وہ

تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ شاہ صاحب نے ”قول الجلیل“ میں کہا ہے اللہ  
 معی (اللہ میرے ساتھ ہے) کا مراقبہ کرو۔ اللہ کی نسبت ساتھ ہونے کو خوب  
 مضبوط تصور کرو۔ باوجود پاک ہونے اس ذات مقدس کے جہت و مکان سے (قول  
 الجلیل)۔ حق سبحانہ ہر جگہ موجود ہیں۔ فَأَيْنَمَا تَوَلَّوْا۟ اِلٰیہِ یعنی تم اپنا منہ جدمصر  
 پھیرو وہیں ہے ذات اللہ کی۔ شاہ عبدالعزیزؒ اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں  
 کرتے ہیں ”ہر جا ایسا وہ روئے خود را بسوائے او گردانید و باو متوجہ شوید، پس  
 در ہموں مکان است حضور خدا و قرب او“ یعنی تم جس جگہ بھی کھڑے ہو کر اپنا منہ  
 اُس ذات پاک کی طرف کرو اور اس کی طرف متوجہ ہو پس اسی جگہ ذات خداوندی اور  
 اُس کا قرب ہے، ذات باری کے سوا اور کسی کی ہستی ایسی نہیں ہے کہ وہ اپنے یاد کرنے  
 والے کی طرف توجہ کرے، خواہ اندھیرا ہو خواہ روشنی۔ خواہ جنگل ہو خواہ شہر، بندے  
 نے توجہ کی اور وہ حاضر۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ بیشک اللہ ہر  
 چیز کے ساتھ موجود ہے۔ شہید کے لغوی معنی اُس ذات کے ہیں جو حاضر ہے  
 اور کوئی شے اس سے غائب نہ ہو سکے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضوری ذات کی نہیں  
 بلکہ علم کی ہے، لیکن صوفیاء کہتے ہیں کہ جہاں صفت ہوگی وہاں ذات بھی ہوگی کیونکہ  
 صفت کا ذات سے انفکاک محال ہے۔ ایک اعرابی نے رسول اللہؐ سے پوچھا  
 ”ہمارا رب قریب ہے کہ اُس سے آہنہ آہنہ باتیں کریں، یا دور ہے کہ اُس کو زور  
 سے پکاریں؟“ عرب کتنے بیدھے تھے لیکن خدائے حکیم کی حکمت ملاحظہ فرمائیے  
 کہ ان کے سادہ سوالات کے جوابات بہت فلسفیانہ اور محققانہ ملتے تھے حضورؐ نے  
 جواب نہ دیا، خاموش رہے اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی وَ اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ  
 عَنِّيْ ذَاتِيْ قَرِيْبٌ ۝ جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب

ہوں کہ اس سے واضح طور پر بندہ کے ساتھ حق سبحانہ کی معیت ثابت ہوتی ہے۔  
بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ کے  
ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، آپ نے فرمایا آہستہ ہو، تم کسی ہرے اور غائب  
کو نہیں پکار رہے ہو، تم اس سننے اور دیکھنے والے کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے  
اور جس کو تم پکار رہے ہو وہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے، اسی حدیث  
سے نقشبندیہ سلسلہ کے بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا ذکر آہستہ ہی افضل ہے۔

خواجہ باقی باللہ فرماتے ہیں کہ بندہ کو حق سے دوری ہی نہیں۔ رسالہ نور وحدت میں  
لکھتے ہیں۔ چون دانستی کہ حقیقت این است معلوم تو شد کہ قرب و بعد مسافت ہمہ از تو ہم  
است کے دوری بوزنا نزدیکی حاصل شود، کے جدائی داشت تا پیوستگی کند، یعنی جب  
تجھے معلوم ہو گیا کہ حقیقت یہ ہے، فاصلہ کا قریب یا بعید ہونا محض وہم ہے دوری تھی ہی کب  
کہ اب نزدیکی حاصل ہو، جدائی کب تھی کہ اب قرب حاصل ہو، حضرت رومیؒ نے خوب کہا،  
سہ اتصالے بے تکلیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق سبحانہ کو انسانوں کی روح سے ایسا قُرب ہے کہ جس کی نہ کیفیت بیان کی جاسکتی ہے،  
نہ خیال میں آسکتا ہے۔ دراصل یہ قُرب وجدانِ سلیم سے حاصل ہوتا ہے حق کی ذات پاک  
بچوں و بیچگون ہے، ایسے ہی ان کا نور السموات والارض ہونا بھی بیچوں و بیچگون ہے۔  
حضرت مجدد الف ثانیؒ وحدت الوجود کے قائل نہیں تاہم ان کے قلم سے یہ اختصار یہ الفاظ نکل  
گئے ہیں۔ "اوسبحانہ تعالیٰ از ہر نزدیک، نزدیک تر است حتی ذات احدیت اور سبحانہ  
نزدیک تر می یابیم از صفاتیکہ ما افعال و آثار آں صفاتیم" یعنی اللہ بندہ سے سب  
نزدیکوں سے زیادہ نزدیک ہے یہاں تک کہ ذات احدیت ان صفات سے بھی زیادہ  
نزدیک ہے کہ جن کے افعال و آثار سے ہمارا وجود ہوا ہے۔

# محبت اور خلوص

دو لوں جہان دے کے وہ سمجھے بہ خوش رہا  
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

✓ حق سبحانہ اتنے فیاض ہیں کہ دو لوں جہان بھی کسی خوش نصیب کو دے سکتے ہیں، لیکن جو صرف ان ہی کو چاہتے ہیں وہ دو لوں جہان پر راضی نہیں ہو سکتے! خسروؑ نے بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔

ہر دو عالم قیمت خود گفستہ نرخی بالا گن کہ ارزانی ہنوز

در اصل اس کائنات کی تخلیق محبت کی بنا پر ہوئی ہے۔ اُن کو اپنی ذات سے محبت ہے، لہذا اپنے نقش سے بھی محبت ہوئی۔ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ ”اللہ“

”ولاء“ سے نکلا ہے اس کے لغوی معنی اُس محبت کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے

ساتھ ہوتی ہے۔ اسی سے اردو میں والہ و رشیدا مستعمل ہے۔ اللہ کے معنی ہیں وہ

محبوب جس کے عشق میں انسان و حیوان بلکہ زمین و آسمان سرگرداں ہیں۔ غالب نے

خوب کہا ہے

دہر جز جلوه بیکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں!

✓ شیخ محی الدین ابن العربیؒ ”فتوحات مکیہ“ میں لکھتے ہیں :-

”اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اُس نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور

انسان مجموعہ عالم ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کا جو علم ہے وہ اپنی ذات  
 ہی کا تو علم ہے کیونکہ وجود اس کے، اور اس کے فعل کے سوا کسی کا  
 نہیں پس ضروری ہے کہ آدم اس کی صورت پر ہوا پس جب  
 اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی عین پر کی، تو عین اس کا مجلی یا تجلی گاہ بن گیا، پس  
 عالم جمال اللہ ہے اور اللہ اپنے ہی جمال کا محب ہے، اب جو عالم  
 کو اس نظر سے محبوب رکھتا ہے وہ جمال حق اور اس کی صورت جمال

ہی کو محبوب رکھتا ہے ۱۱

اللہ سے محبت کی وجہ سے عبادت کرنی چاہیے نہ کہ جنت کی طلب اور دوزخ کے  
 ڈر سے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات پاک خود ہی محبت کی متقاضی ہے، خود ذات  
 پاک، مومن کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مقررین کے دو درجے ہیں ”سالک اور محبوب“  
 سالک وہ ہے جو محبوب حقیقی تک پہنچنے کے خود جدوجہد کرے اور کوشش کے  
 بعد دربار تک پہنچے اور محبوب وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنی طرف کھینچے اور محبوب  
 بنائے۔ قرآن پاک میں اس کی دلیل موجود ہے ”اللَّهُ يُجْتَبَىٰ إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ  
 وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۗ“ یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو چن کر  
 محبوب بنا لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

اللہ سے محبت کیوں کی جائے؟ اس کے بہت سے جواب ہیں۔ اول یہ کہ انسان  
 کا وجود اس کے وجود کا پر تو ہے، اگر اس کی نظر عنایت نہ ہوتی تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا

قرآن میں کسی مومن کا قول اللہ سبحانہ نے نقل کیا ہے ”وَمَا لِي لَا أَحْبُدُ ۗ الْخَلْقَ  
 ” مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔“

یعنی پیدا کرنا ہی ہزار نعمت ہے اگر ابد تک اس کی عبادت کی جائے تب بھی حق ادا

نہیں ہوتا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں ”محبت تمام مقامات کی انتہائی غایت ہے“  
 شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”محبت حیاتِ قلوب و غذائے ارواح  
 اہل ایمان است“ یعنی محبت ایمان والوں کی رُوحوں کی غذا اور دلوں کی زندگی ہے“  
 قرآن میں ہے یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ“ اللہ مومن بندوں سے محبت رکھتا ہے اور  
 وہ اس سے محبت رکھتے ہیں“

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں ”اگر بہشت را خواہند برائے آن خواہند  
 کہ محلِ رضائے اوست تعالیٰ و تقدس و رطلب آن مرضی اوست عز سلطانه و از دوزخ  
 پناہ جویند کہ محلِ سخط مولیٰ است تعالیٰ الخ۔ یعنی صوفیاریا مخلص بندے اگر بہشت  
 کی طلب کرتے ہیں تو محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ حق سبحانہ کی رضا کی جگہ ہے اور  
 دوزخ سے اس لئے پناہ مانگتے ہیں کہ وہ حق سبحانہ کے غضب کی جگہ ہے“

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”رحمتِ خداوندی کی دو قسمیں ہیں  
 عام پیدا کرنا ہے، اور خاص علم و اخلاق میں بعض بندوں کو مخصوص کرنا ہے۔ یہ  
 دونوں عنایتیں وہی ہیں یعنی بغیر طلب ملی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا صفاتی  
 نام ”وہَّاب“ بھی ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن کو علم و اخلاق ملے ہیں۔

امام غزالیؒ کا قول ہے ”اچھا عمل انسان نین و جوہات سے کرتا ہے۔ (۱)  
 دوزخ کے ڈر سے۔ (۲) جنت کی طلب میں۔ (۳) صرف حق سبحانہ کی محبت سے“  
 دوزخ کے ڈر سے جو آدمی عبادت کرتا ہے اس کی مثال اس غلام کی سی ہے جو اپنے  
 آقا کی خدمت اس خوف سے کرتا ہے کہ کہیں وہ سزا نہ دے، جو بندہ جنت کے  
 لالچ میں عبادت کرتا ہے اس کی مثال اس نوکر کی سی ہے جو اپنے آقا کی  
 خدمت انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے، اگرچہ یہ دونوں باتیں بھی



بُری نہیں بلکہ محمود ہیں۔ لیکن سب سے بہتر وہ غلام ہے جو اپنے آقا کی خدمت صرف  
 اس کی محبت اور رضا کی وجہ سے کرتا ہے شیخ سعدی نے خوب فرمایا ہے کہ  
 منت نہ کہ خدمتِ سلطان ہمیں کئی منت شناس از وہ کہ بخدمت گذشتنت  
 یعنی تو یہ احسان نہ رکھ کہ بادشاہ کی خدمت کر رہا ہے بلکہ بادشاہ ہی کا احسان  
 سمجھ کہ تجھ کو اپنی خدمت کے لئے مقرر کیا ہے، ورنہ کروڑوں انسان ایسے ہیں  
 جن کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا۔ اقبال نے اسی نکتہ کو اپنے انداز میں اس  
 طرح پیش کیا ہے کہ

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں "شکر منعم بر منعم علیہ واجب است عقلاً  
 و شرعاً" یعنی بندہ پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا واجب ہے عقلاً بھی اور شرعاً بھی۔  
 دراصل بندہ کی روح کو حق سبحانہ کی طرف ایک کشش ہے جیسے لوہے کو مقناطیس  
 کی طرف۔ دل یا روح میں ایک کشش سی محسوس ہوتی ہے، بندہ کی آنکھوں میں  
 خالق کی محبت کی وجہ سے آنسو آجاتے ہیں، اس کے روکنے پر انسان کو قدرت  
 نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ذکر الہی، صلہ رحمی، جہاد، علم سیکھنا، سکھانا سب  
 کا مقصد محبت پیدا کرنا ہے، ان اعمال کے چھوڑنے سے ایمان بھی کمزور ہوتا  
 ہے اور محبت میں بھی کمی ہوتی ہے تجربہ کاروں کو وجدان سے معلوم ہو جاتا ہے  
 اور وجدان سلیم معرفت و عبادت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

کے غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ دونوں جہان مجھ کو دے کر یہ سمجھے کہ یہ اب  
 خوش ہو گیا، مگر میں شرم سے چپ ہو گیا، فیاضِ مطلق سے تو میں ان کو ہی

چاہتا تھا! ❖ ❖ ❖

# سَمَاع

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع  
گروہ صد آسمانی ہے چنگ و رباب میں

سماع کے معنی ہیں گانا سننا، قدرت کاملہ نے گانے میں ایک اثر رکھا ہے اس سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ سماع کے متعلق دو گروہ ہو گئے ہیں ”ایک اس کو جائز کہتا ہے دوسرا ناجائز“ صوفیاء میں نقشبندیہ و قادریہ سماع کو جائز نہیں سمجھتے۔ چشتیہ صابریہ کے یہاں سماع جائز ہے۔ امام غزالی نے ”احیاء العلوم“ اور کیمیائے سعادت“ میں سماع کا الگ باب لکھا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر خوب بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ”گانا اس لئے حرام نہیں کہ وہ اچھا لگتا ہے، پھول اور خوشبو بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر کوئی ان کو ناجائز نہیں کہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ناجائز ہونے کی وجہ کوئی اور ہے۔

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں:۔ ”جو چیز حسن سے موصوف ہوتی ہے اس کا تعلق عالم علوی سے ہوتا ہے، اور روح انسانی بھی اسی عالم سے ہے۔ جب وہ نعمتِ خوش سنتی ہے، یا کسی صورت کے حسن کا مشاہدہ کرتی ہے تو اس کو اپنا وطن یاد آجاتا ہے اور وہ بے چین سی ہو جاتی ہے، جس طرح سے کوئی آدمی سفر میں ہو اور اس کے وطن سے خط آجائے تو اس کے قلب کی عجیب حالت ہوتی ہے

بہی حال رُوح کا سمجھ لو۔ (رموزِ عشق)

عید کا دن تھا رسول اللہ ﷺ کے گھر میں چند لڑکیاں گارہی تھیں، حضور ﷺ بھی چادر پیٹے ہوئے آرام فرماتھے، روایت میں یہ ہے کہ لڑکیاں دف بجا کر گارہی تھیں چونکہ علماء اور صوفیائے کرام کو رسول اللہ ﷺ کے ہر ہر فعل سے محبت ہے اسی فعل سے جواز اور عدم جواز کو ثابت کرتے ہیں۔ جو سماع کے جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لڑکیاں گارہی تھیں، اگر گانا جائز ہوتا تو حضور ﷺ ضرور منع کرتے، یہ ان کی سب سے قوی دلیل ہے، مگر جو علماء اس کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ عید کا دن تھا اس لئے رسول اللہ ﷺ نے لڑکیوں کو اجازت دے دی تھی تاکہ وہ خوش ہوں، دوسرے لڑکیاں صغیر سن تھیں جو ان اور خوبصورت نہیں تھیں کہ کسی فتنہ کا اندیشہ ہو، تیسرے ساز و سامان وغیرہ ان کے ساتھ نہیں تھا جو خلاف شرع ہے، صرف دف تھی دف کے ساتھ گانے کو اکثر علماء نے جائز کیا ہے۔

بہر کیف اس پر اختلاف ہے۔ امام غزالیؒ نے سماع کے موضوع پر خوب مدلل بحث کی ہے اور آخر میں ایک چٹھی تلی بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

”سماع بلاشبہ اچھی چیز ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ دل میں

جس کی محبت ہوتی ہے اسی کی محبت کو تیز کر دیتا ہے یعنی محبتِ عشق

میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی کسی کے دل میں اللہ اور رسول پاک ﷺ کی محبت

ہے تو سماع اس کو تیز کر دیتا ہے اسی وجہ سے وجد آتا ہے، اگر کسی

شخص کو عورت یا کسی لڑکے سے محبت ہے اس میں شدت لاتا ہے

لہذا اگر کسی کے دل میں سماع سے اللہ اور رسول ﷺ کی محبت پیدا ہوتی ہو تو

اس کو سماع سے ثواب ہوگا، اور اگر کسی کے دل میں عورت یا لڑکے کی



اور صورت میں ذات حق کا جلوہ دیکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ احد الدین کرمانی فرماتے ہیں

زاں می نگریم بہ چشم سر در صورت      زیرا کہ زمعنی ست اثر در صورت  
 این عالم صورت است و ما در صورتیم      معنی نہ تو اں دید، مگر در صورت  
 یعنی میں حسین صورت کو اس لئے دیکھتا ہوں کہ وہ باطن کو دکھاتی ہے، ہم  
 عالم صورت (یعنی ظاہر) میں ہیں، اور باطن کو صرف ظاہر ہی میں دیکھا جاسکتا ہے  
 یقیناً سماع اہل دل کو باطن کی طرف متوجہ کرتا ہے بلکہ ان کے دل کی کھڑکیاں  
 کھل جاتی ہیں۔ لہذا صرف اس حالت میں سماع محمود ہے۔

غالب نے اس شعر کا تصور مولانا رومی کی مثنوی کے پہلے شعر سے لیا ہے،

شعریہ ہے

بشنواز نے چون حکایت می کند      وز جدائی ہا شکایت می کند  
 یعنی بانسری کی آواز گو یا روح کی فریاد ہے جو اسی جگہ جانا چاہتی ہے جہاں  
 سے آئی ہے، دوسرے شعر میں اس تصور کو اور واضح کیا ہے

کز نیتاں تا مرا بہ بریدہ اند      از نفیرم مردوزن نالیدہ اند  
 یعنی وہ بانسری یہ شکایت کرتی ہے کہ مجھ کو ”نیتاں“ سے کاٹ کر دوسرے  
 عالم میں لے آئے ہیں، اب جو میں جدالی میں روتی ہوں تو میرے رونے کے اثر  
 سے مردوزن روتے ہیں۔

غالب کا مطلب یہ ہے کہ چنگ و رباب میں روح کی صدا سمائی ہوئی ہے وہ  
 اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتی ہے چونکہ انسان کے جسم میں بھی روح ہے جب چنگ و  
 رباب سے فریاد کی صدا بلند ہوتی ہے تو انسان کی روح بھی اپنے مرکز کی طرف پرواز

کرنے کے لئے تڑپنے لگتی ہے۔ سماع کو اہل ذوق نے اسی لئے پسند کیا ہے کہ وہ  
احدیت کی طرف کھینچتی ہے کیونکہ ہر نفس کا عین ازل سے ذات حق کے علم میں ہے اس  
سلسلہ میں مولانا اسماعیل شہید لکھتے ہیں :-

”روح الہی کو جو عالم پاک سے ہے اور قَلِ الرُّوحِ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ۞  
اس کی شان میں ہے اور اس مثلتِ خاک یعنی جسم میں مجبوس (مقبید)  
ہونے کے سبب سے اپنی اصل کو بھول گئی تھی اور اس کے ادراک کا آئینہ  
زنگ پکڑ گیا تھا، جب اُس تجلی کے نور سے اُس کا چہرہ مصفیٰ اور مصقول  
ہو گیا اور کمالاتِ حق کا عکس اپنے اندر دیکھا کہ حدیثِ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ  
آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی کی  
طرف اشارہ ہے، اپنی فراموشی اصل کو بھریا دکر کے اصل کی طرف پہنچنے  
کی خواہش کرتی ہے۔۔۔ لیکن چونکہ بشریت کا غبارِ خطیرۃ القدس میں  
پہنچنے سے مانع ہوتا ہے اس لئے ناچار اقتضائے روحانی اور اقتضائے  
نفسانی کے درمیان کشمکش اور مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ بالجملہ یہ  
شورش اور تغلغل جو کہ روحِ نفسانی میں پیدا ہو گئی ہے طالب کو دیوانوں  
اور ستانوں کی طرح آوارہ پھراتی ہے اور اس کی عقل و فکر کو درہم برہم  
کر دیتی ہے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قانونِ شرع اور قواعدِ ادب  
سے باہر کھینچ لے جاتی ہے۔“ (صراطِ مستقیم، صفحہ (۱۱)۔

اس حالت کو مولانا شہید ”حُبِّ عَشْقِي“ کہتے ہیں۔ گانا سن کر جو حالت پیدا  
ہوتی ہے اس عبارت کو بڑھ کر معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہی کششِ باطنی ہے۔



# عبرت

اہل بینش کو بے طوفانِ حوادثِ مکتب  
لطمہ موجِ کم از سبیلِ استاد نہیں

دنیا کو غمگندہ اسی لئے کہتے ہیں کہ چاروں طرف تکالیف، کرب، بے چینی، حادثات، بیماریوں کی کراہیں، مظلوموں کی چیخیں، آہ و بکا، آلام و افکار نظر آتے ہیں۔ اگر اس رنج و محن کی دنیا میں کوئی لمحہ خوشی کا آ بھی گیا تو جلد فرنا ہو جائے گا۔ حافظ نے بالکل سچ کہا ہے۔

مراد منزلِ جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دمِ جرس فریادی دارد کہ بر بنیدِ مہلہا  
”میں اس منزل میں عیش و عشرت کے ایام کس طرح سکون کے ساتھ گزار سکتا ہوں جبکہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور موت عنقریب آنے والی ہے لہذا جو بھی تغیرات اس دنیا میں ہوں، جو بھی حالات پیش آئیں وہ صرف اس لئے ہیں تاکہ انسان اُن کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔“

قالب کا عام شیوہ ہے کہ وہ اہل دانش کو بینش کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حوادث کے جو بھی تھپڑے لگیں وہ گویا استاد کا طمانچہ ہے جو شاگرد کو ہوش میں لانے کے لئے لگایا جاتا ہے۔ خداوند کریم کی عام عادت ہے کہ کسی انسان کی زندگی یکساں نہیں گزرنے دیتا۔ خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

فلاسفہ کے نزدیک دنیا میں خدا کی صفات جلالی و جمالی ہر لمحہ کار فرما رہتی ہیں۔  
اسی میں زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

صوفیاء کے نزدیک آرام، تکالیف، فقر و فاقہ اچھی چیزیں نہیں بلکہ  
نعمتیں ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے رب کریم کی طرف راغب رکھتی ہیں۔ یہ  
انسان کی فطرت ہے کہ وہ عیش میں خدا کو بھول جاتا ہے اور جب کوئی مصیبت  
آتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگتا ہے جس کو قرآن میں ”رُعَاءِ عَرَضِیِّ“  
کہا گیا ہے، اور جب وہ مصیبت ٹل جاتی ہے تو ایسا بے فکر ہو جاتا ہے گویا اس  
پر کبھی کوئی مصیبت آئی ہی نہ تھی۔

ساری دنیا میں ہر قدم پر مصیبت اور تکلیف ہے۔ اگر ان مصیبتوں  
سے بچنا چاہتے ہو تو خلوت گاہِ حق میں پہنچ جاؤ۔ عارف کامل مولانا روم  
نے صحیح فرمایا ہے

بیچ کتھے بے درد و بے دام نیت جز نخلوت گاہِ حق آرام نیت  
دنیا کے ہر گوشہ میں کوئی کھیر یا ہر کونے میں کوئی دام فریب میں ملے گا۔ اگر دنیا میں  
کہیں آرام و سکون ہے تو ذکر الہی میں ہے۔ دنیا کے واقعات محض عبرت  
کے لئے ہوتے ہیں۔ اگر غم کو کوئی تکلیف پہنچے تو سمجھ لو کہ اس سے  
بڑی تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے۔ غرض دنیا میں جو کچھ بھی مصیبتیں ہیں وہ گویا  
اُتار کا ٹاپنچہ ہیں جو بندوں کا دماغ درست کرنے کے لئے ہیں۔ مازنا، جلانا، رونا  
اور ہنسانا سب خدا کی طرف سے ہے۔ عقلمند وہ ہے جو ان حوادث میں ثابت قدم  
رہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز غم کو بڑی معلوم ہو مگر وہ تمہارے واسطے  
حقیقت میں مفید ہو۔ قرآن میں اس نکتہ کو بڑے ہی دل نشین انداز میں



سمجھایا گیا ہے۔ اور جب خدا دیکھ رہا ہے تو کوئی فکر کی بات ہی نہیں فَاِنَّكَ  
 بِاَعْيُنِنَا (حق سبحانہ نے رسول اللہ کو کہا ہے کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے

ہے)



# وحدت فی الکثرت

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم  
کر دیا کافر، ان اصنام خیالی نے مجھے

غالب بھی ان ہی صوفیاء کے ہم زبان ہیں جو ایک ہی وجود مانتے ہیں اور کثرت کو وہم سمجھتے ہیں۔ غالب کا مذکورہ شعر اسی عقیدے کا ترجمان ہے۔ وہ ایک خطا میں خود لکھ چکے ہیں اور کئی مرتبہ خود بھی زبان سے اقرار کر چکے تھے کہ ذات (وجود) ایک ہے۔ وہی عقیدہ انہوں نے اس شعر سے ظاہر کیا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف وحدت ہی کائنات کی ہر شے میں کار فرما ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم کثرت اور اشیاء کی مختلف شکلوں کو حقیقت سمجھنے لگیں تو یہ وہم کی پرستش ہوگی یہاں وہ کہتے ہیں کہ اگر میں ان اصنام خیالی کو حقیقت سمجھنے لگوں تو کافر ہو جاؤں۔ بہ الفاظ دیگر یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے سب وہم ہے موجود در اصل ذات احدی ہے محققین صوفیاء کا تصور یہ ہے کہ ان اشیاء کی صورتوں میں مصروف ہو جانا غفلت ہے اور یہ خدا کی حکمت ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے :- ”شیخ الاسلام ہر وی میفرماید کیسکہ مرا یک ساعت از حق سبحانہ غافل سازد، امیدست کہ گناہان اور بہ نخواستند۔ وجود بشریت را غفلت در کار است۔ حق سبحانہ و تعالیٰ از کمال کرم خویش ہر یکے را

ایشان بہ اندازہ استعداد بہ اموریکہ مستلزم غفلت اندظاہر ایشاں را  
برآں امور مشغول ساخته است جمع را بہ سماع و رقص الفت داده و طائفہ  
را تصنیف کتب و تحریر علوم و معارف شاعر ساختہ و گروہی را بہ بعضی  
امور مباح مشغول داشتہ۔ (مکتوب نمبر ۲۹۱ جلد اول)

یعنی شیخ الاسلام ہر وی فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ کو تھوڑی دیر کے لئے بھی حق سبحانہ  
سے غافل کر دے تو امید ہے کہ خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اس میں راز یہ  
ہے کہ بشر کے وجود کے لئے غفلت ضروری ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے انتہائی  
کرم سے ہر شخص کو اس کی استعداد کے مطابق غافل کر دیا ہے اور ایسے کاموں میں مصروف  
کر دیا ہے جو اس کی طبیعت کے مطابق ہیں کسی کو سماع و رقص میں مصروف کر دیا،  
کسی کو کتابوں کی تصنیف میں لگا دیا اور بعض کو دیگر مباح باتوں میں مشغول کر دیا ہے۔  
حضرت مجددؑ ایک جگہ ”فصوص الحکم“ (مصنفہ شیخ اکبرؒ) کا حوالہ دیتے ہوئے  
لکھتے ہیں :-

ایک مرتبہ مجھے فنائے حقیقی حاصل ہوئی اور دل کو اس قدر وسعت  
پیدا ہوئی کہ تمام عالم کو، عرش کو، بلکہ خود کو، بلکہ عالم کے تمام ذرات  
کو حق دیکھا، بلکہ عالم کے تمام ذرات کو اپنا عین دیکھا۔ سارے عالم کو  
ایک ذرہ میں گم پایا، پھر میں نے اپنے آپ کو اور ہر ذرہ کو نور پایا۔  
دنیا کی اشیاء کی صورتیں اس نور میں مضمحل ہو گئیں۔ جب میں نے  
حق سبحانہ سے عرض کیا کہ یہ کیا ہے تو فرمایا کہ توحید میں حق البیقین کا  
مرتبہ یہی ہے۔ اور اس مقام کو ”جمع الجمع“ کہتے ہیں۔ اس کے بعد  
میں جن ذرات عالم کو حق دیکھ رہا تھا پھر میں نے ان ہی ذرات کو

موجود ہو پایا۔ اس حالت پر مجھے بہت حیرت ہوئی، اسی اثناء میں  
میں نے پیر بزرگوار سے ”فصوص الحکم“ کی عبارت سنی تھی وہ یہ ہے  
”ایک حالت ایسی ہوتی ہے اگر تو چاہے تو کہہ دے کہ یہ عالم حق ہے  
اگر چاہے تو کہہ دے کہ یہ عالم خلق ہے چونکہ ان میں تمیز نہیں ہو سکتی  
لہذا یہ مقام حیرت ہے۔“ اس عبارت سے کچھ تسکین ہوئی، اس  
کے بعد عنایت خداوندی سے موجود حقیقی (خدا) کو موجود متخیل سے  
جدا پایا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عارف پر ہر لمحہ مختلف مقامات گذرتے ہیں۔  
”وحدت فی الکثر“ حالت سگر (بے ہوشی) ہے، حالت صحو نہیں ہے۔  
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی عارف کو حق محسوس ہوتا ہے اور خلق  
معقول، اور کبھی خلق محسوس ہوتی ہے اور حق معقول ہے۔ عارف کی حالتیں  
بدلتی رہتی ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک جگہ فرماتے ہیں: لَا مَعْبُودَ إِلَّا اللَّهُ  
اور لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ میں فرق ہے، جن کی حالت وحدت فی الکثر  
کی ہے وہ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ کا ہی لغو لگاتے ہیں۔ خود مرزا غالب نے  
ایک جگہ لکھا ہے ”تنہائی میں میرا رویہ رہتا ہے“ لَا مَوْجُودَ إِلَّا اللَّهُ  
مرزا غالب کے الفاظ اور اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا ”فنا کی حالت“  
میں بہت عرصہ تک رہے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ مکتوبات جلد اول کے صفحہ ۱۴۲ پر لکھتے ہیں:-  
”دریں مرتبہ حق را سبحانہ نہ منصل عالم یافت و نہ منفصل، نہ داخل

عالم نہ خارج نسبت معیت و احاطہ و سر بیان بر نہجیکہ اول می یافت  
بالکلیہ مستغنی گشت ۱۱

یعنی اس حالت میں میں نے نہ حق سبحانہ کو عالم سے متصل پایا نہ اس سے دور  
اور نہ عالم میں داخل پایا نہ عالم سے خارج۔ مجھ پہلے معیت و احاطہ کی جو نسبت  
معلوم ہو رہی تھی وہ بالکل معدوم ہو گئی ۱۱  
پھر تحریر فرماتے ہیں :-

۱۱ معلوم گشت کہ حق سبحانہ و تعالیٰ را بہ عالم نسبتے است و را را این  
نسبت مذکورہ و آں نسبت چہول الکبفیت است ۱۱

یعنی مجھے معلوم ہوا کہ حق سبحانہ کو عالم سے اس نسبت کے علاوہ کوئی اور نسبت  
ہے اور وہ نسبت ایسی ہے کہ جس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی ۱۱  
اس ساری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ عالم کو اشیاء کی کثرت میں جو وحدت  
نظر آرہی ہے وہ ذوقی ہے، ہر عارف کے ذوق کے مطابق ۱۱ اور برکے کے قول  
کے مطابق جو چیز جس کو محسوس ہو رہی ہے وہ اس کے لئے موجود ہے ۱۱



# تصوف میں مختلف مراتب

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے  
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

غالب کا یہ شعر عشق حقیقی کے متعلق ہے اس میں کسی صورت سے بھی عشق مجازی نہیں۔ ہر آدمی خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس حقیقت مستتر کو پانے کی کوشش کرتا ہے، حق سبحانہ کی بارگاہ لا اہتا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ اس کی بارگاہ بے نہایت ہے ع

صد ہزاراں پردہ آمد تا الہ

”اللہ تک لاکھوں پردے ہیں“ ان کی ذات پاک کا خاصہ ہے جو بھی ان تک پہنچنا چاہتا ہے اس کو روکتے نہیں۔ ”برہمن ازم“ میں اس کو ”دھیان“ کہتے ہیں۔ افلاطون بھی اپنی قوتِ متخیلہ کی بدولت ”وحدت الوجود“ کی منزل تک پہنچ گیا۔ باوجودیکہ اس نے نبیؐ کی تعلیم کو ماننے سے انکار کر دیا اور صاف اعلان کر دیا تھا ”ہم ہدایت یافتہ لوگ ہیں ہم کو اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی شخص ہم کو راہِ ہدایت دکھائے“

حضرت مولانا اسماعیل شہید نے ایسے فلسفیوں کے بارگاہِ ہدایت کے قریب پہنچنے کی حقیقت خوب بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”ایسے لوگوں کا شہنشاہ

کی مملکت تک پہنچنا ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو شہنشاہ کے کسی قلعہ تک پہنچ جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس ذریعہ مطیع پہنچتے ہیں وہ بھی پہنچ گیا ہے مگر مطیع کے پہنچنے سے شہنشاہ راضی ہے اور اس کو ہمیشہ رہنے کی اجازت دے سکتا ہے مگر جو چوری، ڈاکہ، یا مکاری سے پہنچتا ہے اس کو شہنشاہ وہاں سے نکلوا دیتا ہے بلکہ وہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔

جو صوفیائے کرام بارگاہِ عالیہ تک پہنچتے ہیں ان کے مختلف مراتب ہیں۔ حق سبحانہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مقرب نبی ہوتا ہے، اس کے بعد صحابی، جس کو نبی سے سب سے زیادہ روحانی فیض پہنچتا ہے۔ اولیائے کرام کو بھی حسب استعداد فیض پہنچتا ہے۔ بعض مومن ولی کا مرتبہ رکھتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں جانتا کہ یہ ولی ہے۔

قاضی ثناء اللہ ریانی پتی "ارشاد الطالبین" میں لکھتے ہیں کہ بعض ولی کو تو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولی ہے دوسروں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ ان اولیاء میں بہت سے مرتبے مشہور ہیں۔ غوث، قطب، ابدال، محدث، مجدد، محبوب، مجذوب، قلندر، وغیرہ۔ بعض ولی اویسی ہوتے ہیں جو کسی کے مرید نہیں ہوتے مگر اللہ ریانی سے براہ راست (بلا واسطہ) اخذ فیض کرتے ہیں جیسے اولیں قرنی۔ ان میں بعض مومنین اللہ کو طلب کرتے ہیں، اس سے محبت رکھتے ہیں اور بعض ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو حق سبحانہ خود منتخب کر لیتے ہیں۔ قرآن میں اس کا ثبوت موجود ہے **اللَّهُ يُجْتَبَىٰ إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَىٰ مَن يُنِيبُ** ۵ حق سبحانہ جس کو چاہتے ہیں اس کو منتخب کر لیتے ہیں اور ان آدمیوں کو بھی ہدایت دیتے ہیں جو ان کی طرف پہنچنا چاہتے ہیں۔

صوفیاء میں چار فرقے بہت مشہور ہیں۔ نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ  
صابریہ، سہروردیہ،۔ التذکرہ پہونچنے کے اور بھی لاتعداد طریقے ہیں۔ اس  
موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو صوفی شریعت کا زیادہ اتباع کرے گا وہی حق سبحانہ  
سے زیادہ قریب ہے۔ ایک حدیث ہے کہ فرانس سے زیادہ کوئی عمل حق سبحانہ  
سے قریب کرنے والا نہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ رسول اکرمؐ کے قدم بہ قدم  
چلنے والا صوفی زیادہ کامل ہوگا۔ شیخ سعدی، شیخ شہاب الدین سہروردی کے  
مرید تھے، فرماتے ہیں سے

محال است سعدی کہ راہ صفا توں رفت جز بر پے مصطفیٰ<sup>۱۴</sup>  
یعنی اے سعدی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کو چھوڑ کر اور راستے  
سے راہ صفا یعنی تصوف کے راستے پر چلنا محال ہے۔

ان ہی نے "گلستاں" میں اشارہ کیا ہے سے  
ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تومی روی بہ ترکستان است  
یعنی اے اعرابی مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ نہیں پہونچ سکے گا۔ کیونکہ جس راستے  
پر توجیل رہا ہے وہ ترکستان جاتا ہے "۔

کسی بزرگ سے مرید ہونا محمود ہے مقصود نہیں۔ ہزاروں اللہ کے دوست  
ایسے گزرے ہیں جو کسی سے مرید نہیں ہوئے، البتہ استادوں کے معتقد تھے ان کا  
احترام کرتے تھے، ان میں اکثر ائمہ مجتہدین شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوافل  
اور قرآن خود خدا سے قریب کرنے والے ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے :-

"میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعہ تقرب حاصل کرتا ہے یہاں تک  
کہ میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ



ہو جاتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے پکڑتا ہے اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے چلتا ہے“ (بخاری) دیکھے اس میں مرید بننے کا ذکر نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرید نہ ہونا چاہیے بلکہ مرید ہونا نفل چیز ہے اگر نہ ہو تو کوئی مواخذہ نہیں۔ ہر بندے کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہے اور نبیؐ کا واسطہ کافی ہے۔

اس طرح نفل عبادت سے بندہ بقول شبلیؒ ”متصل بالحق اور منقطع عن الخلق“ ہو جاتا ہے۔ غالباً نے اس موقع کا نفیس شعر کہا ہے

بندہ را کہ بہ فرمانِ خدا راہِ رُود نہ گذارند کہ در بندِ زینجا باشد  
یعنی جو بندہ اللہ کے حکم پر عمل کرے اس کے تہلکے ہوئے راستے پر  
چلے اس کو حضرت یوسفؑ کی طرح زینجا کی قید میں نہیں چھوڑا جا سکتا غالب  
کی بلند پروازی قابلِ داد ہے۔ یعنی جو بندہ اللہ کا ہو جاتا ہے اس کو  
حق سبباً، غیر میں مشغول نہیں رکھتے۔

”بند زینجا“ لفظ کی داد نہیں دی جا سکتی۔ یعنی زینجا کی قید میں اس کو نہیں چھوڑتے ہیں“

دوسرا مطلب یہ ہے کہ حق کے فرماں بردار بندے کو انسان کا محتاج نہیں رکھتے بلکہ غیر سے بالکل منقطع کر دیتے ہیں اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا  
(کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں ہے؟)

بعض صوفیاء نے قرآن کے اس فقرے سے وَابْتَغُوا الْيُسْرَى  
الْوَسِيْلَةَ سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ اللہ تک رسائی کے لئے کسی کامل  
سے مرید ہونے کی طرف اشارہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس کو وہ

سارے طریقے پسند ہیں جو بندہ کو ان کی بارگاہِ عالیہ تک پہنچائیں۔  
 ایک حدیث ہے ”دُنیا اللہ کے نزدیک ملعون ہے مگر ذکرِ الہی اور جو چیز  
 بھی ذکر میں معاون ہو سکے“ اسی لئے اللہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی  
 مرشدِ کامل سے بیعت ہو جانا اللہ تک پہنچنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ وَكَلِّ  
 وَعَدَ اللَّهُ الْحُسَيْنِ (اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں سے ہی جنت کا وعدہ  
 کر رکھا ہے) ہو سکتا ہے مسلمانوں کے ان کی استعداد کے لحاظ سے مختلف  
 مرتبے ہوں مگر ان کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ اُس سے ادنیٰ سے ادنیٰ  
 مسلمان بھی ناامید نہیں ہے۔ اس آیت شریفہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔  
 حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اللہ عز و جل کا جو تصور پیش کیا ہے  
 وہ اور کسی مذہبی کتاب نے پیش نہیں کیا۔ ”اللہ“ کا لفظ اس قدر  
 مؤثر ہے جو ساری صفات کو جامع ہے۔



# دنیا کی بے شبانی

ہاں! کھائی موت فریب ہستی

ہر چند کہیں کہ ”ہے“ نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجا جو اسد

عالم تمام حلقہ و ام خیال ہے

عالم حادث یعنی فنا پذیر ہے۔ یہ فلسفیوں کا متفقہ مسئلہ ہے۔ البتہ متاخرین  
دنیا کے فنا ہونے کے قائل نہیں۔ اسی طرح اشرافی حکماء بھی عالم کو فنا پذیر نہیں مانتے۔  
اور وہ کیسے فنا پذیر مان سکتے ہیں جبکہ وہ کائنات کو ذات خداوندی کا ظل (پر تو)  
سمجھتے ہیں۔ چونکہ ذات قدیم (غیر فنا پذیر) ہے لہذا اس کا ظل بھی قدیم ہوا۔  
دیکھئے انسان کو اگر نبوت کا فیض نہ پہنچتا تو عقل گمراہی کے بھنور میں کتنی ڈبکیاں  
لینتی۔ جن حکماء کو نبوت کا فیض نہیں پہنچا ہے ان کی اکثر باتیں احمقانہ ہوتی ہیں۔

شوہنہار (مشہور فلاسفر) نے صحیح کہا ہے :-

”دنیا میں کوئی مہمل سے مہمل بات ایسی نہ ملے گی جس کا باور کرنے

والا کوئی عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو، اب اتنے مفروضات

پیدا ہو گئے ہیں کہ صحیح سے صحیح اصول کی نسبت گمان ہوتا ہے کہ وہ

کسی واقعیت کا پرتو نہیں بلکہ انسانی ذہن کی ایجاد ہے “  
(سیرۃ النبی از علامہ شبلی)

غالب کے مذکورہ بالا دونوں اشعار کا مطلب بادی النظر میں یہ ہے کہ ساری دنیا موموم ہے۔ فلسفیوں نے آج تک جو حقائق کی ہیں وہ بہت مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً فلسفیوں کا ایک گروہ گدرا ہے جو ”سوفسطائی“ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے عقیدہ کو ”سفسطہ“ کہتے ہیں۔ ”سفسطہ“ کہتے ہیں ”ہر چیز کو موموم سمجھنے کو“۔ سوفسطائی حکماء کہتے ہیں کہ ساری کائنات موموم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ چونکہ ظاہر پر شعری بھی ان کے عقیدہ کی تائید کر رہے ہیں لہذا ہم کو اس کا الگ باب قائم کرنا پڑا۔ نازک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا ہے کہ بعض صوفیاء بھی اس کائنات کو وہم کے مرتبے میں رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ حال سے مغلوب ہو گئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اس مسئلہ کی نزاکت سے بے خبر نہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے :-

”صوفیاء کہ عالم را موموم گفته اند نہ بد آں معنی است کہ عالم محض اختراع و تراش و ہم است کہ مذہب سوفسطائی بے خرد است بلکہ موموم بہ آں معنی است کہ در مرتبہ وہم بخلق خداوندی جل شانہ مخلوق گشتہ است و در اں مرتبہ بہ صنع او تعالیٰ ثبوت و استقرار پیدا کردہ لیکن خیر و کمال کہ دروے ثابت است مستعار از حضرت وجود است تعالیٰ و تقدس و ظلمت است از ظلال کمالات آں مرتبہ مقدسہ و نشر و نقص کہ دروے کائنات مستعار از عدم است“ (مکتوب ۹۷ جلد سوم)۔

یعنی صوفیائے کرام نے جو کائنات کو موموم کہا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ ساری دنیا محض وہم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ یہ عقیدہ تو سوفسطائی فلسفیوں کا ہے

جو بالکل بے عقل ہیں بلکہ صوفیاء کے نزدیک دنیا کا موہوم ہونا یہ ہے کہ خدائے  
 قادر نے عالم کو وہم کے مرتبہ میں پیدا کر دیا ہے، اور خالق کی صنوت کا ایک کرشمہ  
 ہے۔ بلکہ کائنات سے ثابت ہے اس سے خدا کا خیر و کمال ظاہر ہے اور ذات  
 واجب الوجود کا فیضان ہے اور اس کائنات میں جو نقص اور شر نظر آتا ہے وہ  
 سب عدم کے اثر سے آیا ہے۔

اور واضح طور پر سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں نیکی کے بدلے میں جنت اور برائی  
 و کفر کی پاداش میں دوزخ ملتی ہے۔ اگر یہ سب وہم ہوتا تو انسان کے متعلق  
 حکیم مطلق اتنا بڑا فیصلہ نہ کرتا۔ لہذا غالب کے جن اشعار میں ”وہم“ معلوم ہوتا  
 ہے اس کو دنیا کے حدوث اور فنا پذیری کی طرف اشارہ تصور کیجئے۔ ایسا ہی  
 غالب کا ایک اور شعر ہے۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام مہر گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیوں  
 مشہور فلاسفر برکلی کا قول ہے کہ جو چیز محسوس ہے وہ موجود ہے۔ اس  
 اصول کے مطابق دنیا محسوس ہو رہی ہے لہذا موجود ہے۔ برکلی کا یہ قول یاد رکھیے  
 آئندہ متعدد مقامات پر اس کی ضرورت پڑے گی۔ خواب کو عام لوگ محض وہم  
 سمجھتے ہیں مگر اس اصول کے مطابق جس عالم میں بھی کوئی چیز محسوس ہو وہ  
 دیکھنے والے کے نزدیک موجود ہے، جس کو محسوس نہیں ہو رہی ہے اس کے لئے

موجود نہیں ہے۔



# تَوَكَّلْ

اس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند  
واسطے جس نشہ کے غالب گنبد بے در کھلا

مزا غالب نے تصوف میں یہی شعر آسان کہا ہے۔ توکل کیا ہے؟ توکل  
کے معنی کسی قابلِ اعتماد وکیل کو اپنا کام سونپ کر خود مطمئن اور بے فکر ہو جانا۔  
لیکن کسبِ ضروری ہے پتھر کی طرح پڑا رہنا خلاف عقل و شرع ہے۔ مولانا رومی  
فرماتے ہیں۔

گر توکل می کُنی، دُو کار کُن کسب کن، پس تکیہ بر جبار کُن  
”یعنی اگر توکل کرنا ہے تو دو کام کر، پہلے کسب کر اس کے بعد خدا پر بھروسہ کر“  
روزی کے لئے دو ڈر دھوپ کرنا توکل کے منافی نہیں۔ حضرت مجدد فرماتے ہیں  
”توسط اسباب منافی توکل نیست“ (مکتوب ۲۶۶ جلد اول) اسی مکتوب  
میں فرماتے ہیں۔ ”حق سبحانہ و تعالیٰ ہر شخص کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ  
کرتا ہے، جو اسباب سے مدد دیتا ہے اس کو اسباب کے ذریعہ مدد ملتی ہے اور  
جو اسباب پر نظر نہیں رکھتا اس کا کام اسباب کے بغیر بھی کر دیتا ہے۔ یہ  
حدیث قدسی اس کا ثبوت ہے۔ ”أَنَا عِنْدَ الظَّنِّ عَبْدِي بِي مِمَّنْ  
تُدْرِي كَمَا تَقْدِرُ عَلَيْهِ“ اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں جو بھی گمان میرا ساتھ رکھتا ہو“

اللہ سبحانہ نے ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، عقل وغیرہ اسی لئے پیدا کئے ہیں کہ انسان اُن سے کام لے۔ ان اعضاء کی ہیئت ہی تقاضا کر رہی ہے کہ اُن سے کام لیا جائے۔ بلاشبہ احتیاج اور مصائب انسان کو اپنے خالق کی طرف بلا ارادہ راغب کرتے ہیں۔ انسان جب عیش میں ہوتا ہے تو اللہ کو بہت کم یاد کرتا ہے بلکہ بھول ہی جاتا ہے حالانکہ عیش و کامرانی میں اس کا زیادہ شکر یہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ انسان کو بقدر ضرورت بلا قرض روزی ملے اور تندرست رہے اپنے خالق کو یاد کرے بس گویا اس کو سلطنت ملی ہوئی ہے۔ حدیث ہے **قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ**.... الخ، یعنی وہ بیشک مُراد کو پہنچا جو مسلمان ہوا، اس کو بقدر ضرورت روزی ملی اور اللہ نے اس کو جتنا دیا اس پر قناعت نصیب کی۔ (مسلم بروایت عبد بن عمرؓ)

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم الدین" میں توکل کا راز اپنے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں :-

"توکل در اصل توحید کا نام ہے۔ توحید کے اعتقاد سے ایک حالت طاری ہوتی ہے اور اس حالت کی وجہ سے وہ مخصوص افعال صادر ہوتے ہیں جن کو توکل کہتے ہیں۔ لیکن پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ (۱) زبانی اقرار۔ (۲) اعتقاد قلبی اور اقرار زبانی (۳) کشف کے ذریعہ یہ مشاہدہ ہونا کہ تمام افعال ذات باری سے صادر ہوتے ہیں، اسباب و وسائل کو کچھ دخل نہیں۔ (۴)۔ یہ مشاہدہ ہونا کہ عالم میں ذات باری کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں۔"

ان مراتب چہارگانہ میں پہلے دو مدارج کو توکل کے وجود میں کچھ دخل نہیں، توکل کی ابتداء تیسرے درجے سے شروع ہوتی ہے

یعنی بذریعہ کشف یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی علت صرف ذات باری ہے۔ بیچ کے اسباب اور وسائط بالکل بیکار ہیں، جس طرح بادشاہ کوئی حکم بذریعہ تخریر نافذ کرتا ہے تو کاغذ، قلم اور دوات کو اُس حکم کی علت نہیں کہہ سکتے۔ تو انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے سوا اور اسباب اُس کی نظر سے بالکل چھپ جاتے ہیں، اس حالت میں جو کچھ کہتا ہے خدا سے کہتا ہے، جو کچھ مانگتا ہے خدا سے مانگتا ہے، اسی کا نام ”توکل“ ہے۔ (الغزالی صفحہ ۶۷)۔۔۔۔

پھر بھی احام صاحب اسباب پر زور دیتے ہیں کیونکہ انبیاء کا یہی طریقہ ہے انھوں نے صاف طور پر فرمایا ہے۔

”اسبابِ قطعی کو نہیں چھوڑنا چاہیے جو اسبابِ قطعی کو چھوڑ دینا وہ مجنون ہے“ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔ فَهَذَا جُنُونٌ وَ لَيْسَ مِنَ التَّوَكُّلِ مِنْ شَيْءٍ الْخ... یعنی اسباب سے مدد نہ لینا محض جنون ہے، اس کو توکل سے کچھ بھی لگاؤ نہیں لگاؤ، کیونکہ مثلاً اگر تم اس بات کے منتظر ہو کہ خدائے کوروی کے بغیر سیر کر دے گا یا روٹی کو یہ قوت دیدے گا کہ وہ خود تم تک چلی آئے، یا کوئی فرشتہ مقرر کر دے گا کہ روٹی کو چبا کر تمہارے منہ میں ڈال دے تو تم نے اللہ سبحانہ کی عادت کو بالکل نہیں پہچانا۔“ (احیاء العلوم)

✓ دراصل احتیاج سے توکل پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور دیگر بزرگان دین سارا روپیہ پیسہ اس لئے خیرات کر دیا کرتے تھے کہ احتیاج

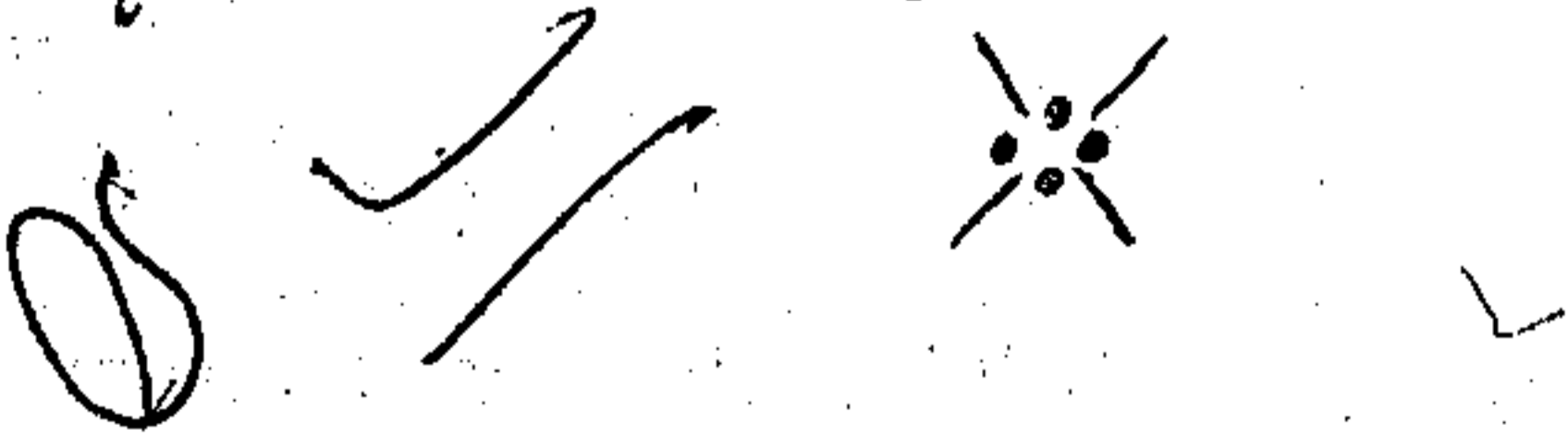


باقی رہے، مومن خدا سے دعا کرے، اس کے آگے گڑ گڑائے اور اس میں توکل کی صفت پیدا ہو، اسباب سے مدد لے لیکن اسباب پر بھروسہ نہ کرے اللہ سبحانہ خود ترغیب دے رہے ہیں۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا؟ کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟

جو بندہ اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کے وکیل بن جاتے ہیں۔ انسان وکیل پر کب بھروسہ کرتا ہے؟ (۱) وکیل موکل کے کیس کو خوب جانتا ہو (۲) وکیل انتہائی دانش مند ہو۔ (۳) وکیل موکل کا خیر خواہ ہو۔ (۴) وکیل موکل کا حق دلانے پر قادر ہو۔ (۵) وکیل موکل کی پوری زندگی اور اس کی خواہشات سے واقف ہو۔ اب خود انصاف کیجئے اللہ سے بڑا دانش مند کون ہو سکتا ہے۔ سارے انسانوں کو اسی کے پر تو سے عقل ملی ہے۔ اللہ کا علم لپیٹا ہے۔ پیدائش سے پہلے سے ابد تک کو وہ جانتا ہے۔ خود قرآن میں سوال کیا ہے۔ ”کیا وہ بھی نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟“

کسی شاعر نے خوب کہا ہے

از خدا خواہم و از غیر نہ خواہم بخدا کہ نیم بنده دیگر، نہ خدائے دیگرست  
خدا کی قسم میں خدای سے طلب کروں گا دوسرے سے نہیں مانگوں گا  
کیونکہ میں خدا کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں ہوں اور نہ کوئی اور خدا ہے۔



# انسان

بلکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی کروڑوں بلکہ اربوں ہیں لیکن انسان بہت کم ہیں۔ اگر عقل و شعور نہ ہو، آدمی اخلاق سے مزین نہ ہو تو پھر وہ بھی ایک حیوان ہے خواہ اس کو حیوان ناطق ہی کیوں نہ کہیں۔ چوپائے بھی کھاتے ہیں پیتے ہیں، بول و براز کرتے ہیں، نفع کی چیز کی طرف دوڑتے ہیں، مضر چیزوں سے بھاگتے ہیں۔ انسان اگر اشرف المخلوقات ہے تو محض اس لئے کہ وہ عقل رکھتا ہے اپنے خالق کو پہچانتا ہے۔ انسان کو معرفت کے لئے ہی دنیا میں لائے ہیں۔ انسان کو صوفیاء عالم صغیر کہتے ہیں۔ یعنی چھوٹی سی کائنات۔ اس کی ہڈیاں جمادات ہیں، اس کے بال نباتات، اس کی رگوں میں خون اُس طرح ہی بہتا ہے جس طرح دریاؤں اور نہروں میں پانی، اس کو بھوک پیاس اسی طرح لگتی ہے جس طرح ایک بیل یا گھوڑے کو، مگر معرفت کی استعداد کا یہ عالم ہے کہ فرشتوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے بلکہ مسجود ملائک بنتا ہے۔ غالب نے انسان کی پستی اور بلندی کی طرف بڑا حسین اشارہ کیا ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

خالق کائنات نے انسان میں کمالات کا انبار لگا دیا ہے۔ شہوت اور غضب  
یعنی قوتِ بہیمیہ بھی اس کو عطا کی ہے، اسی لئے اس میں چوپایوں جیسی صفات  
بھی ہیں۔ اور قوتِ ملکیت بھی دی ہے یعنی فرشتوں کی کسی خصلت یا قوت  
بہیمیہ کو زمین سے مدد ملتی ہے اور قوتِ ملکیت کو آسمان سے۔ بالفاظِ دیگر  
روح عالمِ علوی کی چیز ہے اور جسم عالمِ سفلی کی۔ جب انسان کی روح جسم سے جدا  
ہوتی ہے تو جسم زمین پر رہتا ہے اور روح انسانی عالمِ بالا یعنی عالمِ برزخ  
میں چلی جاتی ہے۔ قرآن کے مطابق جیسا کہ امام غزالیؒ نے بھی تصریح کی ہے  
انسان کو صرف اس لئے دنیا میں لائے ہیں کہ آخرت میں حق سبحانہ کے نزدیک  
رہنے کی لیاقت پیدا کرے، اگر انسان دنیا میں صرف تن پروری میں مصروف  
رہے تو وہ بہت بڑا احمق ہے، یعنی ایسی چیز میں مصروف ہو جائے جو عارضی ہے۔  
جو انسان معرفت اور عبادت میں مشغول رہے وہ بڑا عقلمند ہے کیونکہ ایسے  
عالم کے لئے تیاری کر رہا ہے جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

انسان میں اس کے اعمال سے روح متاثر ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض  
کیا کہ انسان میں شہوت اور غضب دو بڑی صفات ہیں، ان سے متعدد صفات پیدا  
ہوتی ہیں۔ حکیم و فلسفی ارسطو نے ایک کتاب ”تہذیب الاخلاق“ لکھی ہے۔ اس میں  
انسان کے اخلاق پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نے بتلایا ہے کہ آدمی  
انسان کس طرح بنتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

”انسان میں دو باتیں خاص ہیں۔ خلق اور خلق“ اگر ہم کہیں کہ فلاں

شخص کا خلق اور خلق دونوں اچھے ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا

ظاہر بھی اچھا ہے باطن بھی۔ منطق کی رو سے خلق کی تعریف اس طرح کی جاتی

ہے۔ ”روح میں ایسے ملکہِ راسخہ کا پایا جانا کہ جس کی وجہ سے انسان سے اچھے یا بُرے افعال بے تکلف آپ سے آپ سرزد ہوں۔ خلق کے لئے افعال کا صادر ہونا شرط نہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص شجاع ہے یا سخی ہے مگر اس کو شجاعت یا سخاوت کا مظاہرہ کرنے کا موقع نہیں ملا، تو اس کو ہم شجاع اور سخی کہہ سکتے ہیں۔ غضب اور شہوت سے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً غضب کی قوت میں اگر افراط و تفریط نہ ہو، وہ عقل کے قابو میں ہو تو اس کو شجاعت کہتے ہیں۔ اگر افراط کی طرف مائل ہوگی تو ہورکھلاگی اور تفریط کی طرف جھکے گی تو بزدلی، کم وصلگی، احساس کمتری پیدا ہوں گی۔ شہوت میں اگر اعتدال ہو تو اس سے عفت پیدا ہوگی۔ عفت مختلف ساچوں میں ڈھل کر یہ صفات پیدا کرتی ہے جو داجیا، صبر و رگزر، قناعت، پرہیزگاری، لطیف مزاجی، خوش طبعی، اور بے طمع، افراط و تفریط ہونے سے حرص، طمع، بے شرمی، فضول خرچی، ریاکاری، رندی، اوباشی، بیجا خوشامد، حد، شک جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں۔“ عقل کا بھی یہی حال ہے، عقل کی قوت معتدل رہتی ہے تو حسن تدبیر، جودتِ ذہن، اصابتِ رائے پیدا کرتی ہے۔ اس میں افراط آتا ہے تو مکر، فریب، حیلہ سازی، عیاری جیسے اخلاق پیدا ہوتے ہیں تفریط ہوتی ہے تو حماقت، سادہ لوحی، نا فہمی اور ناعاقبت، اندیشی پیدا ہوتی ہیں۔ یہ معلومات ارسطو سے ابن مسکویہ نے لیں، اور ابن مسکویہ سے امام غزالی نے فائدہ اٹھایا ہے۔“ (الغزالی صفحہ ۶۴ و ۶۵)

صوفیاء انسان کو "عالم صغیر" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سارے عالم کا خلاصہ ہے۔  
اس میں حد درجہ کی جامعیت ہے۔ حق سبحانہ نے کہا ہے کہ انسان کی جامعیت  
ہی قُرب کا سبب ہے اور اُس کی جامعیت ہی بُعد کا سبب ہے۔ حضرت مجدد الف  
ثانیؒ نے خان خاناں کے نام جو مکتوب تے جلد اول میں لکھا ہے اُس کو اس طرح  
شروع کیا ہے "در بیان آنکہ آدمی را جامعیت او سبب بُعد است، چنانکہ  
ہمیں جامعیت او سبب قرب است"۔ اس کے بعد یہ حدیث قدسی لکھی ہے  
"لَا يَسْعَىٰ اَرْضِي وَلَا سَمَآءِي وَلَا يَسْعَىٰ قَلْبَ عَبْدِي الْمُؤْمِنِ"  
(یعنی نہ زمین میں سما سکتا ہوں نہ آسمان میں بلکہ اپنے بندہ مؤمن کے قلب میں  
سما سکتا ہوں)۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "پس بہترین ہمہ موجودات انسان آمد و  
بدترین ہمہ کائنات ہم او"۔ یعنی لہذا سب موجودات میں بہترین مخلوق انسان ہی ہے  
اور کائنات میں بدترین بھی وہی ہے۔ بہترین میں محمدؐ کا نام مبارک مثال میں پیش  
کیا ہے اور بدترین میں ابو جہل کا۔ اگر انسان شریعت کا اتباع کرے، معرفت حاصل کرے  
تو انسان بہترین مخلوق ہے اگر کفر و شرک اختیار کرے تو مخلوقات میں بدترین بھی وہی ہے  
کیونکہ اور جانداروں کے لئے عذاب ابدی نہیں ہے مگر انسان کے لئے ہے۔ لہذا جہنم  
کاسب سے زیادہ مستحق بھی انسان ہی ہے اور بدترین عذاب کا مستوجب بھی آدمی ہی ہے  
اسی لئے بزرگان دین خوف سے کہا کرتے تھے کاش میں گھاس ہوتا، کاش میں پتھر ہوتا  
بعض بزرگ پرند کو دیکھ کر کہا کرتے تھے تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھ کو کوئی عذاب نہیں۔  
"کاش میں گھاس ہوتا" یہ حضرت ابو بکرؓ ہی کا قول ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ واقعی آدمی  
کو انسان بننا کس قدر مشکل ہے۔ اور انسان کو دوزخ سے نجات بلکہ حق سبحانہ کا قرب صرف اُس  
کی معرفت اور عبادت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے ورنہ پھر حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔

# استعداد اور تکلیف

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر  
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدحِ خوار دیکھ کر

طور پہاڑ ہے، برقِ تجلی اس چیز پر گرنی چاہیے جس کو شعور ہو، چنانچہ جب تجلی ہوئی تو پہاڑ کا سرمہ ہو گیا مگر حضرت موسیٰ ؑ صرف بے ہوش ہوئے غالب کا یہ شعر اس آیت کی طرف اشارہ ہے "إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَنزَلْنَاهَا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ" پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین، اور پہاڑوں پر پیش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا اور ڈر گئے البتہ انسان نے اس امانت کو اٹھالیا۔"

حافظ شیرازی نے بھی اس آیت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے مشہور شعر میں پیش کیا ہے۔

آسماں بارِ امانت نہ تو انت کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زد  
آسماں امانت کے بوجھ کو نہ اٹھا سکا، لیکن انسان نے اس بارِ عظیم کو اٹھالیا۔  
"امانت" اس جگہ بڑا ہمہ گیر اور بامعنی لفظ حق سبحانہ نے استعمال کیا ہے۔ امانت کے معنی ہیں "بمعنی خداوند کریم کے احکامات پر عمل کرنے کی استعداد انسان کے سوا کسی اور مخلوق میں نہیں خواہ وہ آسمان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے پیش

کرنے سے کوئی یہ تصور نہ کرے کہ فی الواقع خدا نے آسمانوں، زمین اور پہاڑ سے کہا ہوگا کہ اس کو اٹھاؤ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور وہ ڈر گئے۔ حق تعالیٰ نے قرآن میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ دراصل ایک زبانِ قال ہوتی ہے اور دوسری زبانِ حال۔ زبانِ قال تو بولنے والی زبان کو کہتے ہیں لیکن ”زبانِ حال“ اس زبان کو کہتے ہیں جس کی حالت دیکھ کر ہی اس کے جواب کا اندازہ لگایا جاسکے۔ مثلاً حیوان اور انسان کے دانت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ چبانے یا کاٹنے کے لئے ہیں۔ پانی زبانِ حال سے کہتا ہے میں پینے، دھونے، نہانے اور سیراب کرنے کے لئے ہوں۔ آگ زبانِ حال سے کہتی ہے میں جلانے، کھانا پکانے اور چاندی سونا وغیرہ بگھلانے کیلئے ہوں۔“ اسی لئے خداوند کریم نے فرمایا ہے ”لَا يَكِفُّ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وَسَعَهَا“ اللہ نے کسی نفس کو اس کی صلاحیت سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ مثلاً چوپایوں کو عبادت اور معرفت کا حکم نہیں دیا۔ اس موقع پر ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ”حجۃ اللہ الباقیہ“ سے اقتباس پیش کرتے ہیں :-

”امام غزالیؒ اور بیضاویؒ وغیرہ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ یہاں امانت سے مراد عہدہ تکلیف ہے جو کہ آسمان اور زمین کے آگے پیش کیا گیا اور جس کی وجہ سے اللہ سبحانہ کی عبادت کرنے سے ثواب اور اس کی معصیت کرنے سے عذاب ملتا ہے اور ان کے آگے پیش کرنے سے ان کی استعداد اور قابلیت کا اندازہ لگانا مراد ہے کہ وہ اس کو سراسر انجام دے سکتے ہیں یا نہیں۔ ان کے

انکار کرنے سے ان کی عدم لیاقتی اور لا استعدادی مراد ہے یعنی وہ اس کو سرانجام نہیں دے سکتے۔ اور انسان کے اٹھانے سے اس کی لیاقت اور استعداد مراد ہے۔ اور اب میں (شاہ صاحبؒ) کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر خداوند تعالیٰ کا یہ قول کہ ”الانسان ظالم اور جفاکار جب اہل (ظَلُمًا جَهْلًا) تھا“ اس کی استعداد کی علت بیان کر رہا ہے یعنی ظالم وہ ہوتا ہے کہ عادل نہ ہو لیکن اس میں عدل کی لیاقت ہو۔ اسی طرح جاہل وہ ہوتا ہے کہ جو جانتا نہ ہو لیکن اس میں جاننے کی لیاقت ہو، چنانچہ سوائے انسان کے اور جتنی مخلوق ہے یا تو وہ محض عالم و عدل ہے کہ ظلم و جہل کی وہاں رسائی ہی نہیں جیسے فرشتے یا وہ محض ظالم و جاہل ہیں جیسے چوپائے کہ ان میں علم اور عدل کی لیاقت ہی نہیں۔ لہذا امانت یا تکلیف کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جس میں کمال بالقوۃ ہو بالفعل نہ ہو (یعنی کسی ہو فطری نہ ہو)۔ اس آیت میں جو لِيُعَذِّبَ“ کا لفظ ہے اس میں ”لام عاقبت“ ہے یعنی امانت اٹھانے کا انجام یا راحت (جنت) ہے، یا رنج (دوزخ)۔ یعنی انسان کو اپنے عقیدہ اور عمل کے نتیجے میں یا تو جنت نعیم ملتی ہے یا نارجمیم“

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ جس مخلوق کے ایک ایک قول اور فعل پر جنت یا دوزخ ملتی ہو اس کی اہمیت خالق کے نزدیک کتنی ہے!

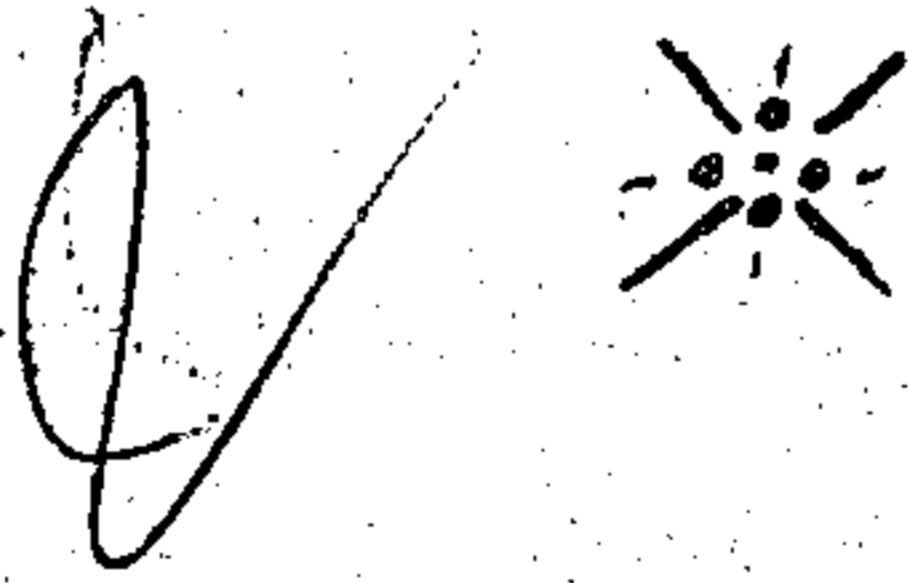
انسان کی خلقت پر ایک مرتبہ اور غور کیجئے، پہلے اس کے جسم میں لچک پیدا کی پھر نماز کا حکم دیا۔ پہلے اس میں بھوک پیاس پیدا کی پھر روزہ کا حکم دیا۔ چلنے پھرنے، سفر کرنے کی صلاحیت پیدا کی پھر حج کے احکام نازل کئے۔ کمانے اور روزی



پیدا کرنے کی استعداد رکھی اس کے بعد زکوٰۃ فرض کی۔ بازو میں زور اور دل  
میں شجاعت پیدا کی اس کے بعد جہاد کا حکم دیا۔ عقل پیدا کی پھر عبادت اور معرفتِ الہی  
کا مکلف کیا۔ جتنے بھی شریعت کے احکام ہیں وہ سب ”ظرفِ قدحِ خوار“ ہی دیکھ  
کر نازل کئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان برقِ تجلی کی تاب نہ لاسکے مگر جنت میں تاب  
لا سکے گا۔ انسان دنیا میں معرفت اور عبادت سے اس قابل بنتا ہے کہ جنت میں  
رہنے کا شعور پیدا ہو جائے۔ ہر ایک کو یہ دولت نصیب نہیں ہوتی

ابن دولت سمد ہمہ کس رانہ دہند

استعداد بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی، رہنمائی بھی انھوں نے کی، ہدایت کا راستہ  
بھی انھوں نے ہی آسان کیا، اور پھر جنت میں وہی لے جاتے ہیں، گناہوں سے  
بچا کر، معاف کر کے۔ ان کی عنایتیں انسان پر بے شمار ہیں، انسان خود بھی غور کر کے  
ان عنایتوں کا احساس کر سکتا ہے۔ قرآن میں سرتاسر اسی کی تعلیم ہے، کیوں غور  
نہیں کرتے، اپنے نقیوں اور آفاق میں غور کرو، ایک ایک چیز میں حق سبحانہ کی  
جلوہ گری دیکھو گے۔ اور اس کی حکمتوں کا تماشا کرو گے۔“



# گناہ

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک  
میرا سروا من بھی ابھی تر نہ ہوا تنھا

یہ وہ مشہور شعر ہے کہ جس کو پڑھ کر ذوق پیروں سرد صفا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ”غالب کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی، ہم نے ”گناہ“ کا عنوان اراداً ”خیر و شر“ کے بعد رکھا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ خیر و شر ہے اور شر ”عدم“ ہے۔ حق سبحانہ کی یہ حکمت بالغہ ہے کہ وہ خیر کو باقی رکھنے اور شر کو فنا کرنے کی طرف مائل ہے۔ بیماری کے جراثیم شیشہ کے ٹکڑے پر رکھ دو تو وہ چوبیس گھنٹے زندہ رہیں گے، لیکن ان کو انسان کی متصلی پر رکھ دو تو ایک منٹ کے اندر تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔ یہ اشارہ اس طرف ہے کہ انسان کے اندر مدافعت کا مادہ موجود ہے۔ مومن گناہ کرے ایمان کے تقاضے سے یا تو اس کا اثر ہی نہ ہوگا یا معاف کر دیا جائے گا یعنی توبہ سے۔

غالب کہتے ہیں کہ میں دریائے معاصی میں غرق ہونا چاہتا تھا لیکن میرا سروا من بھی تر نہ ہوا تنھا کہ دریائے معاصی خشک ہو گیا۔

حق سبحانہ گناہوں کو بہت معاف کرتے ہیں و یعفو عن کثیر یعنی وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے۔ ہر نیکی سے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتا ہے

اور توبہ سے بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کر دیا جائے گا۔ حدیث صحیح ہے التَّائِبُ  
مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ، یعنی جس شخص نے گناہ سے توبہ کر لی  
گویا اس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ گناہ معمولی بات ہے۔ گناہ کرنے سے (حدیث  
کے مطابق) دل یا روح میں سیاہ نقطے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اگر ان انہکی کرتا  
ہے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے ورنہ دل زنگ آلود ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ دل پر  
مہر لگ جاتی ہے اور پھر مدد ایت قبول کرنے کی استعداد ہی نہیں رہتی۔ اس نکتہ  
کو سمجھ لیجئے۔

غالب کا ایک مشہور شعر ہے

آہا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یادِ مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ  
عام طور پر اس شعر کی تشریح شارحین نے اس طرح کی ہے کہ جب خدا  
قیامت میں غالب سے حساب لے گا تو وہ اپنے رب سے کہیں گے کہ میرے  
گناہوں کا حساب نہ مانگیے کیونکہ مجھے وہ حسرتیں یاد آگئی ہیں جو گناہ کرنے کی  
میرے دل میں باقی رہ گئی ہیں۔ "شوخی تو اور بات ہے لیکن حقیقت سے اس  
کو کوئی نسبت نہیں۔ قیامت کا دن ہولناک دن ہے، اُس دن غالب بچا ہے  
کی کیا ہمت ہوگی کہ وہ خداوند ذوالجلال کے سامنے ایسی جرات کر سکے کہ لانا  
گناہ توبہ میں کر ہی چکا مگر اور بھی حسرتیں باقی ہیں۔ غالب بہت مشکل پسند شاعر ہیں  
ان کے شعر کا مطلب اتنا آسان ہو ہی نہیں سکتا۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا مطلب اپنے اشعار میں پیش  
کرتے ہیں مگر اپنے خاص انداز میں۔ دراصل ایک حدیث ہے کہ بعض مومن ایسے

بھی ہوں گے کہ جو اپنا نامہ اعمال پڑھیں گے تو ان کو گناہ بہت نظر آئیں گے۔  
اس کے بعد گھبراہٹ میں دوبارہ پڑھیں گے تو ان کو گناہوں کی جگہ نیکیاں  
لکھی نظر آئیں گی۔ تو مومن خداوند سبحانہ کی اس عنایت کو دیکھ کر کہے گا کہ میرے  
اور بھی گناہ لکھنے سے رہ گئے ہیں تاکہ ان کی بجائے بھی نیکیاں مل جائیں۔

غالب یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ میں جب اپنے  
نامہ اعمال میں گناہ لکھے ہوئے دیکھوں گا اور پھر ان کی بجائے نیکیاں درج کی  
ہوئی نظر آئیں گی تو رب رحیم سے عرض کروں گا کہ میرے ان گناہوں کی حسرتیں  
بھی درج ہو جائیں جو بعض موانع کی وجہ سے میں دنیا میں نہ کر سکا تھا۔ اب یہ  
جارت نہیں رہی بلکہ رحمت کی طلب بن گئی۔ اور غالب یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔  
قرآن میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے **اُولَئِكَ يَبْدِلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ**  
**حَسٰتًا** یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں  
سے بدل دے گا۔

ایک اور نازک مسئلہ ہے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ  
کبیرہ گناہوں سے مومن کافر ہو جاتا ہے یا نہیں؟ معتزلہ اور خارجی وغیرہ کہتے  
ہیں کہ ہو جاتا ہے، مگر یہ ایک فرقہ ہے وہ اس کے برعکس عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ  
کہتا ہے کہ انسان اگر مومن ہے تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر  
یہ دونوں عقیدے قرآن اور اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف ہیں۔  
در اصل بعض فرقے انسانوں کی ایجاد ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطابق عمل ہونا چاہیے  
نام کچھ ہی رکھ لو۔ قرآن میں ہے **اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ**  
پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور شرک تو معاف نہیں کرے گا البتہ

اس کے علاوہ اور گناہوں کو معاف کر دیا جس کو چاہے گا۔ یعنی جس مسلمان کو معاف کرنا چاہے گا۔ بس یہ آیت ہی بنیاد ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر اور شرک قابل معافی نہیں۔ اور گناہ خواہ صغیرہ ہوں خواہ کبیرہ معاف ہو سکتے ہیں اور ان کے کرنے سے کافر نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کی حکمت سے بعید ہے کہ وہ صاحب کبیرہ سے بھی وہی معاملہ کرتے جو کافر سے کرتا ہے (حجۃ الباقیہ) امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ میری امت میں تہمت فرقتے ہو جائیں گے ان میں سے صرف ایک جنتی ہے باقی سب دوزخی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی سب فرقتے کافر ہو گئے بلکہ وہ بقدر گناہوں اور بدعتوں کے دوزخ میں جائیں گے لیکن ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہیں گے کیونکہ وہ گنہگار ہیں کافر نہیں ہیں۔ اور قرآن کی رو سے یہ مطلب بالکل صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والے ہیں، معمولی بہانہ سے معاف کر دیتے ہیں۔ مگر جو گناہوں پر اڑ جائے اس کا کیا علاج۔ زہر تو اپنا اثر ضرور کرے گا حکیم کے بتلانے یا منع کرنے سے نہیں بلکہ زہر کھانے کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہے جو اس سے منفک نہیں ہو سکتا۔ ”کفر و ایمان“ پر مفصل بحث آگے آئے گی۔

اب ہم اس اہم مسئلہ پر دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کافر اور گنہگار منزے کرتے پھرتے ہیں ان کو خدا دنیا میں کوئی سزا نہیں دیتا، اگر دنیا میں واقعی ایسا سسٹم ہوتا کہ گنہگار کو گناہ کے بعد فوراً سزا مل جایا کرتی تو کوئی آدمی خوف کی وجہ سے گناہ ہی نہ کرتا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے الفاظ یہ ہیں۔ ”مردم بالطبع راہ نیکی گیرند“ یعنی اگر فوراً سزا مل جایا کرے تو لوگ بالطبع (فطری طور پر) نیکی ہی کرنے لگیں کوئی گناہ ہی نہ کرے۔ دنیا اور آخرت کا جو رابطہ ہے اور دوزخ

اور جنت کا جو وجود ہے یہ سب نظام بیکار ہو جائے۔ پھر بھی اکثر لوگوں کو اس سے دل چسپی ہے کہ نیکی کا کچھ بدلہ دنیا میں بھی مل جائے اور بدی کی سزا بدوں کو مل جائے۔ مگر ایسا کہنے والوں کو یہ خیال نہیں رہتا کہ ان میں بھی بہت بُرائیاں ہیں۔ اگر ان کی سزا ملنے لگے تو ان کو زندگی گزارنا ہی دو بھر ہو جائے۔ بلاشبہ بعض افراد کے لئے مصلحتاً ایسا ہوتا ہے کہ ان کو تنبیہ کے لئے کچھ سزا دینا میں وی جائے مگر خدائے حکیم مصلحت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں، اس کا اندازہ انسان کے جسم کی بناوٹ سے کیجئے، جتنی خوبصورت چیز ہے وہ سامنے ہے۔ پاقانہ، پیشاب، ناک اور کان کا میل وغیرہ چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ مگر ان کا وجود بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے لئے ایسا ہونا لازمی تھا۔ اسی طرح جس کے لئے دنیوی سزا ضروری ہوتی ہے وہ ملتی ہے ورنہ ملتوی رہتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے خوب کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”خارجی (یعنی دنیوی) جزا و سزا کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ وہ اسباب کے فراہم ہوتے پر ملتی ہے، پس جو کوئی اس بات کو سمجھ لے اور ابا سے جو نظام ظہور میں آیا ہے اس کو مد نظر رکھے تو وہ قطعی طور پر جان لے گا کہ خداوند تعالیٰ کسی گنہ گار اور نافرمان کو دنیا میں سزا دینے بغیر نہیں چھوڑتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ نظام کائنات کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب انسان کو راحت و آرام دینے یا رنج و عذاب دینے کے ظاہری اسباب موقوف ہو جاتے ہیں تو اس کو نیک اعمال کے ذریعہ راحت و آرام دیا جاتا ہے یا اعمالِ بد کے ذریعہ رنج و عذاب دیا جاتا ہے اور جب کسی انسان کے لئے رنج و عذاب

کے اسیباب جمع ہو جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ شخص ہوتا نیکو کار ہے  
 تو اگر ان اسیباب کا بند کرنا اس کی نیکو کاری کے مقابلہ میں کچھ بُرا بھی  
 نہیں ہوتا تو اس کے نیک اعمال اُس بلا و مصیبت کو سرے سے  
 دفع کرنے میں، اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو اس کی سختی قدرے  
 کم کرنے میں صرف کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جب کسی کے لئے ایسا  
 تو راحت و آرام کے جمع ہو جاتے ہیں لیکن وہ شخص بدکار ہوتا ہے تو  
 اُس کے اعمال بد اُس نعمت و آرام کے دور کرنے میں صرف  
 ہو جاتے ہیں، اگر اس کے اعمال کے موافق اسباب جمع ہو جاتے  
 ہیں تو اس وقت راحت بھی خوب ملتی ہے اور تکلیف و سزا بھی خوب  
 ملتی ہے۔ لیکن کبھی اعمال کی دنیوی سزا یا جزا ملنے سے نظام کائنات  
 کی مصلحت ضروری ہوتی ہے تو ایسے موقع پر بدکار کو تو نعمت و آرام  
 دے کر کچھ عرصہ مہلت دیدی جاتی ہے اور نیکو کار کو ظاہری طور پر تنگی  
 اور مصیبت میں ڈال دیا جاتا ہے اور یہ تنگی اس کی قوتِ بہیمیہ کے  
 توڑنے میں صرف کی جاتی ہے اور مومن اس پر راضی ہو جاتا ہے،  
 جیسے کوئی شخص کڑوی دوا کو اس کے فائدے کے پیش نظر خوشی  
 خوشی پی لیتا ہے۔ (حجۃ اللہ الی اللہ جلد اول صفحہ ۶۹)

اب ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ بلا شبہ بعض گناہوں کی سزا اور بعض  
 نیکیوں کی جزا دُنیا میں بھی مل جاتی ہے مگر اکثر لوگ محسوس نہیں کرتے اور جن کو خدا  
 نے دیدہ عبرت نگاہ اور گوشِ حقیقت نبوش دیتے ہیں وہ محسوس بھی کرتے  
 ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جو نظامِ عالم کی مصلحت کا لفظ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے،

مثلاً کوئی شخص انتہائی گنہگار ہے اس کو دنیوی سزا بھی ملنا ضروری تھی، مگر اس کے نیچے چھوٹے چھوٹے ہیں یا ماں باپ ضعیف ہیں یا چند کمزور اور مفلس لوگوں کی روزی اس سے وابستہ ہے اس لئے اللہ حکیم اس کا زندہ و تندرست رکھنا یا بلاؤں سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتا ہے، لہذا وہ محفوظ رہے گا۔ نیک آدمی کو بعض بلاؤں سے اسی طرح محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس موقع کے لئے غالب نے نہایت نفیس شعر کہا ہے

بندہ را کہ بفرمانِ خدایا رود نہ گذارند کہ در بند زینجا باشد  
یعنی جو بندہ حضرت یوسفؑ کی طرح اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارے گا  
پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس کو زینجا کی قید میں چھوڑ دے۔ دنیوی سزا و  
جزا کا راز یہ ہے کہ جو شخص اللہ سے محبت رکھتا ہے اس کو دنیوی تکلیف، رنج و  
بیماری اس شخص کے مقابلہ میں بہت کم محسوس ہوتی ہے جس نے حق سے رابطہ  
توڑ رکھا ہو۔ اس میں راز یہ ہے کہ اللہ کی محبت کی وجہ سے دل پر ہر وقت ایک  
طرح کی مسرت طاری رہتی ہے۔ اسی وجہ سے فرقہ مرجیہ کے علماء کو غلط فہمی ہوئی ہے  
اور انھوں نے کہہ دیا کہ گناہ مومن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور صرف ایمانِ خالص  
کافی ہے۔ فرقہ معتزلہ (جس کے ہم خیال آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں پائے  
جاتے ہیں) کا خیال ہے کہ گناہ کبیرہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ معتزلہ اور خوارج کے  
سامنے یہ حدیث تھی ”چوری اور زنا مومن نہیں کیا کرتا“ انھوں نے اس کا مطلب  
یہ نکال لیا کہ جو شخص زنا اور چوری یا کوئی اور گناہ کبیرہ کرے وہ مومن نہیں رہتا۔  
حالانکہ ہماری زبان میں بھی محاورہ ہے کہ ”تو مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے“ ظاہر  
ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جھوٹ بولنے سے تو اب مسلمان نہیں رہا بلکہ اس



محاورے کے معنی یہ ہیں کہ جھوٹ بولنا (یا کوئی اور گناہ کبیرہ کرنا) مسلمان کی شان کے نشایان نہیں ہے۔

ایک واقعہ حضورؐ کے سامنے ہوا۔ ایک صحابی کو شراب پینے پر کسی مرتبہ کوڑے مارے گئے، غالباً تیسری مرتبہ خالد بن ولیدؓ نے کہا "لعنت تجھ پر کہ تو سزا پارہا ہے مگر مے نوشی نہیں چھوڑتا،" حضورؐ نے فرمایا "اس کو لعنت مت کرو، یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتا ہے" اس سے ہی اہل سنت و اجماع نے یہ اصول استنباط کیا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کسی مومن سے گناہ (خواہ کبیرہ ہی ہو) سرزد ہو اور وہ اللہ اور رسولؐ سے محبت رکھتا ہو، یعنی بشریت کے تقاضے سے سرزد ہو سکتا ہے لیکن اس کا ایمان نہیں جلے گا، ہم اس کو صرف گناہ گار کہہ سکتے ہیں۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ گناہ معاف کرنا اللہ کے نزدیک کچھ مشکل نہیں مگر یہ ڈر لگتا ہے کہ ہمیں ایمان نہ چلا جائے، "کسی شاعر نے صحیح کہا ہے ع

ایمان اگر یہ قبر بری صد کرامت است

یعنی اگر تو ایمان قبر تک سلامت لے جائے تو سمجھ لے کہ تو کرامتیں تجھے

حاصل ہیں۔ ●●

# ایمان اور کفر

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا  
مومن نہ بود غالب و کافر نہ تو اں گفت

اگرچہ غالب نے یہ شعر شوخی میں کہا ہے مگر اس نے پڑھنے والے کے دل و دماغ کو ایک اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ مطلب اس شعر کا تو یہ ہے کہ ہمیں غالب جیسے شیفتہ سے واسطہ پڑ گیا ہے جو حقیقی معنوں میں مومن بھی بھی نہیں اور اس کو کافر بھی نہیں کہہ سکتے۔ دیکھئے غالب نے یہ نہیں کہا کہ ”کافر نہ بود غالب و مومن نہ تو اں گفت“ کیونکہ کسی مومن کو یہ توہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچا مومن نہیں مگر اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ یعنی کسی مسلمان کو کافر نہیں کہنا چاہیے۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو ایمان لانے کا حق ہے اس طرح ایمان لاؤ۔ قرآن میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا** یعنی اے ایمان والو! ایسا ایمان رکھو جو اس کا حق ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اے مسلمانو! تم ایمان نہیں لانے اب ایمان لاؤ۔ کیونکہ ایمان یقینی چیز ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں مومن ہوں تو یقین کر لو کہ وہ مومن ہے، دل کو چیر کر کوئی دیکھ نہیں سکتا۔

بہر کیف ایمان اور اسلام بہت صاف اور واضح چیزیں ہیں مگر انوس ہے

کہ ایمان و کفر کو ہی ہم نے بازیچہ اطفال بنا لیا ہے، جاہلوں کو چھوڑتے، اکثر علماء دوسروں کو معمولی باتوں پر کافر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن اصل چیز ہے۔ اور نص قطعی ہے، اس میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَهُ لِمَنْ يَشَاءُ** یعنی اللہ شرک اور کفر کو معاف نہیں کرے گا اور اس کے سوا اور گناہوں کو جس کو بھی چاہے گا معاف کر دے گا۔ ایمان اور اسلام میں کچھ فرق بھی ہے۔ ایمان

اللہ، رسول، فرشتوں، کتابوں، قیامت، دوزخ، جنت اور تقدیر کو دل سے مانتے کو کہتے ہیں، اور اسلام کلمہ طیبہ پڑھنے، نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، حج کرنے (اگر استطاعت ہو) اور زکوٰۃ دینے (اگر صاحب نصاب ہو) کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایمان تو رکھتا ہے مگر اسلام کے ارکان پر عمل کرنے میں سست ہے یا کسی ایک رکن یا کسی ارکان کا تارک ہے تو قرآن و حدیث کی رو سے وہ گنہگار مسلمان ہے، کافر نہیں ہے۔

مسلمانوں میں اعمال کے مسئلہ پر اختلاف ہوا ہے اور لاتعداد فرقے ہو گئے۔ اگر ایک فرقہ صرف اپنے کو حق پر کہتا اور دوسرے کو غلط راستے پر کہتا مگر کافر نہ کہتا تو غنیمت تھا مگر ایک فرقہ نے دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا۔ مثال کے طور پر ہم ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ ”جس نے نماز دیدہ و دانستہ چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا“ اس سے معتزلہ اور خوارج وغیرہ نے یہ مسئلہ استنباط کیا کہ کبیرہ گناہ سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اعمال بھی جزو ایمان ہیں۔ امام اعظم اور شاہ ولی اللہ وغیرہ کے نزدیک اعمال جزو ایمان نہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اس عقیدہ کی تائید میں کہ اعمال جزو ایمان نہیں، قرآن کا حوالہ دیا ہے

اور فرمایا ہے کہ قرآن میں ہر جگہ ”آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ آیا ہے۔ واو حرف عطف ہے اور یہ اس جگہ آتا ہے جہاں دو جدا گانہ چیزیں ہوں۔ مثلاً سفید اور سیاہ، بھائی اور بہن، زید اور بکر وغیرہ۔ لہذا ایمان اور چیز ہے اور عمل دوسری چیز ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں ایک مسلمان نے دوسرے کو کافر نہیں کہا بعد میں جب مسلمانوں میں فلسفہ پھیلنے لگا اور ایران کے لوگ مسلمان ہونے لگے، ہر مسئلہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا تو اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ پھر تو یہ حالت ہو گئی کہ ایک ایک مسئلہ پر ایک ایک فرقہ الگ پیدا ہوتا گیا۔ ایک نے کہا ”خدا جسم سے پاک ہے وہ منزہ ہے“۔ مشتبہ فرقہ نے کہا ”خدا جسم رکھتا ہے“ اس نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیا کہ ”خدا نے عرش پر قرار پکڑا“ ایک جگہ قرآن میں ”يَدُ اللّٰهِ“ آیا ہے اس کے معنی ہیں ”خدا کا ہاتھ ہے“۔ مجسمہ فرقہ نے یہ مطلب نکالا کہ خدا کے بھی انسان کی طرح ہاتھ پاؤں سر وغیرہ ہیں۔ ”پھر خلقِ قرآن“ کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ یعنی یہ کہ قرآن بھی اور چیزوں کی طرح مخلوق ہے۔ دوسرے فرقہ نے خصوصاً امام احمد بن حنبل نے کہا کہ ”مخلوق“ نہیں، اللہ کا کلام ہے، کلام، اللہ کی صفت ہے اللہ کی ساری صفات قدیم ہیں، لہذا قرآن بھی قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ اب متاخرین علماء کا اس پر اتفاق ہو گیا ہے ”کلام نفسی یعنی مضمون قدیم ہے صرف حرفِ مخلوق ہیں۔ ورنہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ مخالفوں نے قتل و خون کا بازار گرم کر دیا تھا۔ بغداد کے محلے کے محلے اجڑ گئے تھے۔ انوس کا مقام ہے کہ آج ہمارے دور میں بھی تکفیر کا بازار گرم ہے ایک فرقہ دوسرے کو کافر ورنہ کم از کم بدعتی تو ضرور کہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایمان بہت اہم بلکہ اتمول چیز ہے۔ کسی کو کافر کہنے سے احتراز کرنا چاہیے اور اللہ کے سپرد کرنا چاہیے۔ وہی دل کا حال جانتے ہیں ہم

سے قیامت میں ہمارے ایمان اور اعمال کا سوال ہوگا دوسروں کے عقائد اور  
 اعمال کا نہیں ”لہما ما کسبت و لکم ما کسبتہ“ جو کچھ دوسروں نے کیا  
 وہ بھگتیں گے جو تم کرو گے تم بھگتو گے۔“ تم سے دوسروں کے متعلق نہیں پوچھا جائیگا  
 امام غزالیؒ کا زمانہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا مگر فرقے بھی لاتعداد  
 ہو گئے تھے قریب قریب ایسی ہی حالت تھی جیسی ہمارے دور میں ہے ہر فرقہ اپنے کو  
 حق پر اور دوسرے کو گمراہ تصور کرتا ہے۔ امام غزالیؒ کے زمانہ میں اشعریہ، ماتریدیہ  
 حنبلیہ، مجتہد، مشتبہ، رافضی، خارجی، باطنیہ، مرجیہ، جہمیہ، قدریہ،  
 جبریہ، معتزلہ فرقے بہت مشہور تھے۔ امام موصوف نے ایک رسالہ لکھا ہے جس کا  
 نام ہے ”التفرقة بین الاسلام والزندقة“ یہ دراصل ایک دوست  
 کے نام ان کا خط ہے، اس میں امت کے اختلاف اور ایک فرقہ کو دوسرے  
 فرقہ کے گمراہ کہنے پر خوب روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم اس عبارت کو مین و عن نقل  
 کرتے ہیں تاکہ قارئین حقیقت تک پہنچ سکیں، امام صاحب لکھتے ہیں :-  
 ” جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ، یا معتزلہ، یا حنبلیہ اور دیگر فرقوں  
 کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا مقلد ہے اس کی اصلاح  
 کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ جو شخص اشعریہ کی مخالفت کو  
 کفر خیال کرتا ہے اور اس بنا پر علامہ باقلانی کو کافر کہتا ہے اس سے  
 پوچھنا چاہیے کہ اشعری اور باقلانی اگر باہم مخالف ہیں تو باقلانی  
 کے کفر کو اشعری کے کفر پر کیوں ترجیح ہے؟ اس کا برعکس کیوں نہ  
 ہو؟ اگر باقلانی کی مخالفت جائز ہے تو کراہیسی اور قلاسی کی  
 مخالفت کیوں جائز نہیں؟ اگر وہ شخص کہے کہ معتزلہ کا یہ عقیدہ

عقل میں نہیں آسکتا کہ خدا کی ذات ہی تمام صفات کے بجائے کافی ہے تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ اشعری کا یہ عقیدہ کیوں کر قیاس میں آسکتا ہے کہ کلام الہی میں کثرت نہیں اور پھر وہ امر بھی ہے اور نہی بھی، خبر بھی ہے اور استخبار بھی، قرآن بھی ہے اور انجیل بھی، توراہ بھی ہے اور زبور بھی۔

اگر تم انصاف کرو تو معلوم ہوگا کہ جو شخص حق کو کسی خاص شخص میں محدود سمجھتا ہے وہ خود کفر کے قریب ہے کیونکہ اس نے اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم قرار دیا۔ غالباً تم کو کفر کے معیار کو جاننے کی خواہش ہوگی، تو میں ایک قاعدہ کلیہ بتاتا ہوں، کفر کے معنی صرف یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی جائے اس چیز میں جو ان پر خدا کی طرف سے آئی، لیکن اس میں یہ دشواری پیش آئیگی کہ مسلمانوں میں سے ہر فرقہ دوسرے فرقہ پر یہی الزام لگاتا ہے۔ اشعری معتزلہ کو اس لئے کافر کہتے ہیں کہ معتزلہ احادیثِ روایت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس طرح رسول اللہ کی تکذیب کرتے ہیں۔ معتزلہ، اشعری کی اس لئے تکفیر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک صفات الہی کی کثرت کا قائل ہونا "توحید باری" کے خلاف ہے اور رسول اللہ کی تکذیب ہے اس مشکل کے حل کے لئے میں تم کو تصدیق و تکذیب کی حقیقت بتاتا ہوں۔

"تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جس چیز کے وجود کی خبر دی ہے اس کے وجود کو تسلیم کیا جائے  
لیکن وجود کے پانچ مدارج ہیں اور انہیں مدارج سے ناواقف  
ہونے کی وجہ سے ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی تکذیب کرتا ہے۔ اس  
لئے میں ان مدارجِ خمسہ کی تفصیل کرتا ہوں۔

(۱)۔ وجود ذاتی یعنی وجود خارجی۔

(۲)۔ وجودِ حسی: یعنی صرف حاسہ میں موجود ہونا، مثلاً خواب میں  
ہم جن اشیاء کو دیکھتے ہیں ان کا وجود صرف ہمارے حاسہ میں ہوتا  
ہے یا جس طرح بیماروں کو جانگنے کی حالت میں خیالی صورتیں نظر آتی  
ہیں یا شعلہ جو آلہ کا دائرہ جو درحقیقت دائرہ نہیں لیکن ہم کو  
دائرہ نظر آتا ہے۔

(۳)۔ وجود خیالی: مثلاً زید کو ہم نے دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں تو زید  
کی صورت جو اب ہماری آنکھوں میں پھرتی ہے، یہ وجود خیالی ہے۔

(۴)۔ وجودِ عقلی: یعنی کسی شے کی اصلی حقیقت، مثلاً جب ہم کہتے  
ہیں کہ یہ چیز ہمارے ہاتھ میں ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری  
قدرت اور اختیار میں ہے تو قدرت اور اختیار ہاتھ کا وجود عقلی ہے  
(۵)۔ وجودِ شبہی: یعنی وہ شے خود موجود نہیں، لیکن اس کے مشابہ  
ایک چیز موجود ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن موت مینڈھے کی شکل

میں لائی جائیگی اور ذبح کر دی جائیگی۔ یہ امام صاحب کے نزدیک

وجودِ حسی ہے، یا ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا "میں یونسؑ کو دیکھ رہا ہوں۔۔ الخ یہ وجود خیالی ہے۔" امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ شریعت میں جن جن چیزوں کا ذکر آیا ہے ان کے وجود کا مطلقاً انکار کرنا کفر ہے، اگر اقسام مذکورہ بالا میں سے کسی ایک قسم کے مطابق اس کا وجود تسلیم کیا جائے تو یہ کفر نہیں ہے کیونکہ یہ تاویل ہے اور تاویل سے کسی فرقہ کو مقرر نہیں، احادیث میں آیا ہے کہ قیامت میں اعمال تو لے جائیں گے، چونکہ اعمال عرض ہیں (یعنی جسم نہیں) اس لئے وہ تو لے نہیں جاسکتے، اس لئے سب فرقوں کو تاویل کرنی پڑی، اشاعرہ کہتے ہیں کہ نامہ اعمال کے کاغذ تو لے جائیں گے، معتزلہ کہتے ہیں کہ تولنے سے انکشافِ حقیقت مراد ہے امام صاحب نے اس پر زور دے کر کہا ہے "جو یہ کہتا ہے کہ نفس اعمال، جو عرض ہیں وہی تو لے جائیں گے اور انہیں میں وزن پیدا ہو جائے گا وہ سخت جاہل ہے" (الغزالی ص ۱۲۸)

امام غزالیؒ کے نزدیک تاویل سے کافر نہیں ہوتا، صاف انکار کرنے سے کافر ہوتا ہے مثلاً قرآن میں ہے "رحمن نے عرش پر قرار پکڑا" ایک فرقے نے کہا کہ خدا عرش پر اس طرح ہے جس طرح بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے۔ دوسرے فرقے نے کہا "یہ خیال غلط ہے، خدا انسان کی طرح جسم نہیں رکھتا ہے، لہذا عرش پر قرار پکڑنے سے مراد حکومت، تسلط اور فرمانروائی ہے، ان تاویلات پر ایک فرقہ کا دوسرے کو کافر کہنا غلط ہے زیادہ سے زیادہ ایک فرقہ دوسرے کو بدعتی کہہ سکتا ہے، اگرچہ یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ حقیقت سے کون فرقہ قریبیے مگر یہ حقیقت ہے کہ دونوں فرقے مسلمان ہیں۔۔



# دُعَاء

گر تجھ کو ہے یقین اجابت، دُعا نہ مانگ  
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

مرزا غالب کی مشکل پسندی کے مطابق دُعا کے متعلق ان کا یہ انوکھا شعر ہے۔  
دُعا کا شعر بہت سادہ اور صاف ہونا چاہیے تھا مگر وہ اتنے سکون سے بیٹھنے  
والے کہاں ہیں جو شخص یہ دُعا کرتا ہو کہ  
یارب ز جنوں طرح غمے در نظر م ریز صد باد یہ در قالب دیوار و درم ریز  
وہ سیدھی سادی دُعا کب مانگے گا؟

✓ غالب مذکورہ شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تجھ کو یہ یقین ہے کہ میری دُعا  
ضرور قبول ہوگی تو دنیا کے لئے کوئی دُعا نہ مانگ، اگر شہنشاہ سے مانگنا ہی ہے  
تو ایسا دل مانگ جس میں سوائے اُس کی طلب کے کوئی مدعا نہ ہو۔  
✓ اس شعر کا یہ مطلب نہیں کہ دُعا مانگنی ہی نہ چاہیے۔ غالب کا علم کس قدر  
وسیع تھا اس کا اندازہ اس کے لفظ "یقین اجابت" سے ہوتا ہے۔ ایک  
حدیث ہے اَدْعُوا اللّٰهَ دَانْتُمْ مَوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ (خدا سے دُعا کیا  
کر و مگر قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے)۔

امام غزالی نے اپنی کتاب "احیاء العلوم الدین" میں لکھا ہے کہ جب حضرت  
ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے لگے تو جبریلؑ آئے اور عرض کیا کہ میں آپ کی مدد کروں؟

انہوں نے جواب دیا ”هُوَ اَعْلَمُ بِحَالِي“ (وہ میرا حال خوب جانتے ہیں)۔  
صاحب نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یوں کہنا کہ اللہ عزوجل میرا  
حال کو جانتے ہیں سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا سوال ہی ہے۔  
ہر سوال زبانِ نال سے نہیں کیا جاتا ہے بعض سوال زبانِ حال سے بھی کئے جاتے  
ہیں۔ کوئی مفلس پھٹے کپڑے پہنے ہوئے بادشاہ کے منہ کھٹرا ہو جائے تو گویا  
اس کی صورت ہی زبانِ حال سے سوال کر رہی ہے۔

حضرت شاہ بہلولؒ ”زبانِ نال سے سوال نہیں کیا کرتے تھے اور فرمایا  
کرتے تھے کہ سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے دعا کی ضرورت ہی نہیں،  
کیونکہ میں نے اپنی رضا کو محبوب کی رضا میں گم کر دیا ہے۔ یہ قول ان کے حال کا  
”تقاضا تھا“ یہ حال ہے اس پر کوئی گرفت بھی نہیں۔

قرآن میں دعا کرنے کا حکم ہے، دعا کرنا فرض ہے ”ادْعُونِي اَسْتَجِبْ  
لَكُمْ“ (مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا)۔ ایک حدیث ہے ”الدُّعَاءُ  
هُوَ الْعِبَادَةُ“ (دعا عبادت ہی ہے) بہر حال دعا مانگنی چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے  
کہ دعا ضرور قبول ہوتی ہے خدا کا وعدہ ہے۔ مگر یہ وعدہ مقید نہیں مطلق ہے۔ اس  
کی مثال یہ ہے کہ ایک بندہ یہ دعا مانگنے لگے کہ ”یا اللہ میں آج ہی اور اسی  
وقت بادشاہ ہو جاؤں“ کیا اس طرح دعا مانگنا جائز ہے، کیا اس طرح کی دعا  
قبول ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں، ”مقصد پورا ہونے پر تفصیلی بحث ”تقدیر“ کے  
زیر عنوان دیکھئے۔ ہر شخص کی دعا اس کے ظرف کے مطابق قبول ہوتی ہے۔ ایک  
شخص دعا کرتا ہے مگر وہ مقصد اس کے لئے مفید نہیں ہوتا اس لئے مرعلیم و خیر  
اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں مولانا رومیؒ نے ایک نکتہ کی بات بتلائی

سُوءِ عَايَا زِيَانِ سِتِّ وَهَلَاكِ اَزْكَرَمِ مِى نَشُوْدِ بَزْدَانِ پَاكِ  
 یعنی جس دُعا کے قبول ہونے سے بندہ کو نقصان پہنچ سکتا ہو اس کو خدائے کریم  
 قبول نہیں کرتے۔ اس کا راز یہ ہے کہ خدا کا علم بسیط ہے ازل سے ابد تک بندہ  
 کی ساری زندگی خدا کے سامنے ہے وہ پیدا کرنے والا ہے، جانتا ہے کہ اس کی  
 استعداد کتنی ہے، کیا وہ اس کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے اگر کسی کی دُعا قبول ہو جائے تو  
 اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ اس بندہ سے راضی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث  
 دہلوی اپنی کتاب ”بلاغ المبین“ میں لکھتے ہیں ”ہر کسے کہ دُعا ئے او قبول شود،  
 رضائے او تعالیٰ برائے او لازم نیست زیرا کہ خدائے تعالیٰ قبول کند دُعا ئے  
 مومن و کافر را“ یعنی جس شخص کی دُعا قبول ہو جائے اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ  
 اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مومن و کافر دونوں کی دُعا قبول کرتا ہے  
 ہماری رائے میں غالب نے یہ شعر اس آیت سے متاثر ہو کر کہا ہے ”اَلَيْسَ  
 اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدًا“ کیا اللہ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں ہے؟ مولانا  
 رومیؒ نے بالکل یہی بات کہی ہے

من نہ شادی خواہم و نہ خسروی      انچه می خواہم من از تو، ہم نوتی  
 اے اللہ میں آپ سے نہ عیش چاہتا ہوں نہ بادشاہی، میں تو صرف آپ ہی

کو آپ سے چاہتا ہوں۔ ●●



# عقل اور مذہب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل  
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

اگر دیدہ بینا کو قطرہ میں دریا، ذرہ میں خورشید، اور جزو میں گل نظر  
نہ آئے تو وہ دیدہ بینا نہیں بلکہ بچوں کا کھیل ہے۔ یہ آسمان، زمین، سورج  
چاند، حیوان انسان، بحر و بر، پہاڑ، ابر و باد، اگرچہ ذات پاک کے حجاب میں  
کائنات کے ذرے نواہائے راز ہیں، سچ پوچھو تو ساز کے پردے میں۔ مگر آنکھ  
والے ان پردوں میں بھی ان کو دیکھ لیتے ہیں، اسی لئے ایک عارف نے کہا  
ہے مَا رَأَيْتُ شَيْئًا إِلَّا رَأَيْتُ اللَّهَ فِيهِ (میں نے دنیا کی جس چیز پر بھی  
نظر ڈالی اُس میں میں نے ذات حق کا جلوہ دیکھا)۔ اسی پر غالب کو حیرت ہے  
جیران ہو کر کہتے ہیں ع

ہیں کتنے بے حجاب کہ میں یوں حجاب میں  
اگر کسی خوش نصیب کو دیدہ بینا مل جائے تو وہ اس حقیقت مستند ہے  
یہ ہیں  
سے قوانین پر عمل

دیکھ سکتا ہے۔

جب انسان دنیا میں آتا ہے تو وہ ایک بے عقل و شعور بچہ ہوتا ہے اس میں دیکھنے، چھونے اور سمجھنے کی قوتیں رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہیں۔ عاقل بن جانے کے بعد بھی دنیا کو سا اہا سال تک ایک ہی طرز پر دیکھتا رہتا ہے۔ سورج نکلتا ہے، غروب ہوتا ہے، دن ہوتا ہے، رات ہوتی ہے، بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے بڑا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے، مر جاتا ہے، اشیاء فنا ہوتی ہیں پھر نئی پیدا ہوتی ہیں انسان فکر معاش اور دیگر افکار میں اس قدر بھنس جاتا ہے کہ اس کو کائنات، اور کائنات کے خالق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اگر دیدہ بیتا یہ احساس نہ کرے کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جائے گا؟ اس غم کدہ میں اس کو کیوں مجبوس کر دیا گیا ہے؟ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ تو وہ دیدہ بینا نہیں بلکہ اندھی آنکھ ہے۔ وہ فلسفی، جانور سے بھی بدتر ہے جو یہ کہے کہ دنیا خود بخود پیدا ہو گئی ہے خالق نے خود بلیغ انداز میں سوال کیا ہے اَلْحَسِبُّكُمْ اَنْمَّا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا؟ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ ہم نے تم کو فضول ہی پیدا کر دیا ہے؟ نہ تم سے باز پرس ہے؟ نہ ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے؟ نہیں! ہرگز ایسا نہیں ہے، ذرہ بھر نیکی کا بدلہ ملے گا اور ذرہ بھر برائی کا بدلہ ملے گا۔

دنیا کی ہر چیز انسان کی خدمت پر مامور ہے، سورج، چاند، سمندر، ابرو باد وغیرہ پھر انسان سے خالق کیا طلب کرتا ہے؟ شیخ سعدی نے اس تصور کو خوب پیش کیا ہے

ابرو باد و منہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نمانے بہ کف آری و بغفلت نہ خوری

از ہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

ل کا اندھا ہی نابینا ہوتا ہے، آنکھوں کا اندھا، اندھا نہیں ہوتا، قرآن

تے فلسفیانہ انداز میں بتلایا ہے فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى إِلَّا بَصَارٌ وَلَكِنْ تَعْمَى  
الْقُلُوبَ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ یعنی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل  
اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

مغرب کے فلاسفروں کی نظر جب قرآن پر پڑی اور اس پر غور کیا تو یہ کہنے  
پر مجبور ہو گئے۔

✓ ”معجزہ ناممکن الوقوع شے نہیں“ (ہیوم)

✓ معجزہ انتہائی حیرت انگیز ہو سکتا ہے لیکن اس کو قبول کرنے کے لئے شہادت  
انتہائی قابل اعتبار ہونی چاہیے۔ (ہیکلے)

✓ ”ہم کارخانہ فطرت میں مداخلتِ خداوندی کے امکان کو باطل نہیں ٹھہرا سکتے،  
جس قوت نے کائناتِ مادی کو خلق کیا ہے، میرے نزدیک وہ اس میں خدشہ و  
اضافہ بھی کر سکتی ہے، اس قسم کے واقعات ایک طرح سے ہمارے لئے ناقابل تصور  
کہے جاسکتے ہیں مگر یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں جتنا خود عالم کا وجود ہے۔“

(ولیم اسٹائل جیونس)..... (سیرۃ النبی جلد چہارم)

ہیگل قرآن پر غور کرنے کے بعد کہتا ہے :-

”خدا انتہائی دانشمند ہے بلکہ اس کی دانش کی کوئی انتہا نہیں۔ جو دہریے  
ہیں خدا کو نہیں مانتے ان کو لیڈروں اور رہنماؤں کے مجسموں اور قبروں کے آگے  
جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم سے زیادہ کوئی دانشمند ہے  
اُس کے آگے تم جھکنے ہو تو ان کے خالق کے آگے کیوں نہیں جھکتے۔“

ہیگل نے خدا کی دانش مندی کے کئی ثبوت دیئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے: ”یہ ہیں  
”زمین لاکھوں میل کی دوری سے سورج کے گرد گھومتی ہے، گرمی مہر کے  
سے قوانین پر عمل

آجاتی ہے، دُور ہو جاتی ہے تو سردی پیدا ہوتی ہے، جب کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے تو سورج اور زمین ہزار ہا سال گزرنے کے بعد بھی کسی دُور میں اتنے قریب کیوں نہیں آئے کہ ساری مخلوق جل کر فنا ہو جائے، کون اس کو تباہی سے روک لیتا ہے؟ میرے نزدیک وہی خدا ہے۔“

قرآن میں ایک جگہ انتباہ کیا گیا ہے ”اگر اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہوتا تو زمین و آسمان ٹکرا کر فنا ہو جاتے۔“

ہم دہریہ فلسفیوں سے سوال کرتے ہیں کہ جب کوئی خالق نہیں تو یہ عجیب و غریب کائنات ہے ہی کیوں؟ کیوں خود بخود پیدا ہو گئی؟ عالم میں یہ نظام کیوں پیدا ہو گیا؟ بیاروں میں کشتش ہے۔ کشتش کیوں ہے؟ یہ کشتش باطل کیوں نہیں ہوتی۔ آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ کر بعض مسلمان بھی کہتے ہیں ”محمدؐ ریفارمر تھے۔“ ان کے دماغ میں پیغمبر اور رسول کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے۔ رسول اکرمؐ نے کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا۔ تاریخ سے ثابت ہے۔ اُن پڑھ شخص خود (نعوذ باللہ) قرآن جیسی عبارت اور فلسفیانہ مضامین نہیں لکھ سکتا۔ ساری زندگی گویا قرآن کی تفسیر ہے، آپؐ کی ہزاروں حدیثیں ہیں، آپؐ کی فصاحت و بلاغت بھی مکمل ہے مگر آپؐ کا عربی ادب قرآن کی ایک چھوٹی آیت سے نہیں ملتا۔ بہت فرق نظر آتا ہے۔ اگر (نعوذ باللہ) قرآن آپؐ کا بنایا ہوا ہوتا تو احادیث کا رنگ بھی یہی ہوتا۔ مخالفین یہاں خاموش ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے خدا کے احکام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ تکوینی اور تشریحی۔ تکوینی احکام یہ ہیں، آگ سے جلنا، پانی سے آگ بجھنا، غسل کرنا، پیاس بجھنا، من لچک ہونا، مرد کا عورت کی طرف، عورت کا مرد کی طرف رجعت کرنا،

اچھی بات سے دل خوش ہونا، جس کو انبساط کہتے ہیں۔ بری بات سے ناخوش ہونا، جس کو انقباض کہتے ہیں۔ غذا کھانے سے بھوک مٹ جانا، جسم کو طاقت پہنچنا۔ مباشرت سے اولاد پیدا ہونا۔ جسمانی غذا کا زمین سے پیدا ہونا، روحانی غذا کا آسمان سے نازل ہونا، مثلاً قرآن کے احکام۔

سائے تشریحی احکام یہ ہیں :-

وضو کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پانی پہلے پیدا ہو چکا تھا، انسان کو نماز پڑھنے کا حکم اس لئے دیا کہ اس کے جسم میں لچک تھی وہ رکوع و سجود کر سکتا تھا۔ روزہ میں بھوک پیاس پر صبر کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ انسان کے لئے بھوک پیاس پہلے ہی پیدا کر دی گئی تھی۔ انسان کو جہاد کرنے کا تشریحی حکم اس لئے دیا گیا کہ انسان میں جنگ کرنے کی استعداد دی گئی۔ دیکھ کر کام کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پہلے آنکھیں عطا کر دی گئی تھیں۔ ہاتھوں کی بناوٹ ایسی رکھی کہ جس سے انسان ہر کام کر سکے۔ زکوٰۃ اور صدقہ کا حکم اس لئے دیا کہ انسان بسر اوقات کے لئے ضرور کماتا ہے غصہ کو روکنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ پہلے غصہ پیدا کر دیا گیا تھا، غرض ایک ایک چیز میں حکمت ہے انسان کہاں تک شمار کرے۔ تشریحی احکام کو ہی "تکلیف" کہتے ہیں تشریحی احکام، تکوینی احکام کے بعد نازل ہوتے ہیں، یعنی انسان کو اس وقت کسی کام کے لئے کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے اس کام کو کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اس راز کو اس آیت شریفہ میں بیان کیا گیا ہے :-

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا یعنی خدائے حکیم کسی شخص کو اس کی طاقت

سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، یہاں "تکلیف" کے معنی دکھ بیماری کے نہیں ہیں

بلکہ "تکلیف" قرآن کا محاورہ ہے اس کا مطلب ہے کہ شریعت کے قوانین پر عمل



کرنے کا حکم ایسی مخلوق کو دیا جائے جو اس پر عمل کرنے کی استعداد رکھتی ہوگی (اس کے متعلق "استعداد اور تکلیف" کے زیر عنوان مزید تفصیل کر دی گئی ہے)

عقل کا نقصان ہے کہ اپنے صالح کار قرار کیا جائے۔ تمام عبادات اور نیکیوں کی اصل اللہ کے وجود کا اقرار ہے۔ دنیا پرستوں کے نزدیک خواہ اس کی اہمیت نہ ہو مگر دانش مندوں کے نزدیک خالق کا اقرار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جو لوگ واجب الوجود کا اقرار نہیں کرتے، ان کو سکون میسر نہیں، ان کی روح مضطرب رہتی ہے، وہ خدا سے نہیں ڈرتے لیکن ہر چیز سے ڈرتے ہیں، ان کو ہر اندھیرے میں ایک بھوت، ہر بیشہ میں ایک شیر نظر آتا ہے، ان کو ہر قدم پر موت نظر آتی ہے۔ چونکہ آخرت کا یقین نہیں لہذا سوچتے ہیں کہ جتنا بھی جینا ہو دنیا میں جیئیں، عیش و کامرانی کے زیادہ سے زیادہ اسباب جمع کر لیں۔ قرآن میں ان ہی لوگوں کے لئے فرمایا گیا ہے کہ "ان کے دل تو ہیں مگر سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں، یہ لوگ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی بدتر۔ آج قرآن کو دیکھ کر فلاسفر حیران ہیں کیونکہ حقیقت ایک ہی وقت میں ان کے سامنے آگئی ہے۔"

یہ دنیا عجیب ہے۔ آج عاقل وہ سمجھا جاتا ہے جو خدا کے وجود کا انکار کر دے جو یہ کہے کہ ساری کائنات طبیعت سے پیدا ہوگئی ہے۔ اگر کوئی ان سے سوال کرے کہ انسان خود ہی پیدا ہو گیا اور اس کو بنانے والی طبیعت ہے تو انسان میں تناسب کیوں ہے؟ آنکھیں پیٹ پر یا کمر پر کیوں نہیں؟ کھانا منہ سے ہی کیوں کھایا جاتا، دماغ سے ہی کیوں سوچا جاتا ہے؟ "بول و براز کی جگہ" جسم کے اندر اپنی ساخت کے لحاظ سے موزوں اور پوشیدہ کیوں ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ جواب دیا جاسکتا

ہے کہ ہم کو ایسا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور کوئی خالق نہیں تو آپ کی پسندیدہ باتیں ہی کیوں پیدا ہوئیں؟ غالب نے خوب فلسفیانہ بات کہی ہے۔

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا  
انسان کے اعضاء کی بنا و ط میں تناسب اور حسن کیوں ہے؟ ھَلْ مَرَّ  
خَالِقٍ غَيْرِ اللّٰہِ (کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے؟)  
اقبال نے صحیح کہا ہے۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

اقبال "جاوید نامہ" میں لکھتے ہیں۔

می شناسی طبعِ ادراک از کجا است؟ حورے اندر بنگہ خاک از کجا است؟  
طاقتِ فکرِ جیساں از کجا است؟ قوتِ ذکرِ کلیساں از کجا است؟  
این دل و این واردات از کجاست؟ این فنون و معجزات از کجاست؟  
گرمیِ گفتار داری؟ از تو نیست! شعلہ کردار داری؟ از تو نیست!  
این ہمہ فیض از بہارِ فطرت است فطرت از پروردگار فطرت است  
جالتے ہو طبعِ ادراک کہاں سے آئی ہے؟ مٹی سے حسین چہرے کس نے بنائے؟  
داناؤں کی دانش، کلیموں کو بولنے کی طاقت، دل اور اس میں تختیگات،  
فنون اور معجزات کس نے پیدا کئے؟ تجھ میں گرمیِ گفتار ہے، مگر تیری نہیں!  
تجھ میں شعلہ کردار ہے مگر کہاں سے آیا؟ میں بتلاؤں! یہ سب بہارِ فطرت کا فیض  
ہے اور فطرت خود اللہ کا پرتو ہے۔

دنیا کی دو چیزیں سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ انسان اور قرآن۔ انسان

جیوان اور فرشتے کے درمیان عجیب مخلوق ہے اگر اس میں صفاتِ ملکیت نہ ہوں تو وہ بالکل جیوان ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اور اس میں صفاتِ بہیمیت نہ ہوں تو وہ فرشتہ ہے بلکہ اس سے بھی برتر۔ انسان کی نیکیوں کی قدر خدا کے یہاں اسی لئے زیادہ ہے کہ وہ اپنی بہیمی خواہشات کو عقل کے ذریعہ قابو میں رکھتا ہے۔ قرآن اس لئے عجیب ہے کہ اللہ کا کلام ہے، کلام اللہ کی صفت ہے، جہاں اللہ کی صفت ہوگی وہیں اس کی ذات ہوگی۔

مولانا اسماعیل شہید نے قرآن کی خوب مثال دی ہے انہوں نے فرمایا ہے کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان گویا ایک دستار ہے جو شہنشاہ کسی غلام کو دیدے جس کا ایک سر ابادشاہ کے پاس ہے اور دوسرا سر اربندہ نے پکڑ رکھا ہے اور شہنشاہ نے اس غلام سے کہہ رکھا ہے کہ جب تجھ کو کوئی حاجت پیش آئے تو اس دستار کو ہلا دیا کر ہم تیری حاجت پوری کر دیں گے۔

در اصل قرآن بہت ہی انمول ہے، یہ اللہ کی صفتِ کلام ہے جو ان کی ذات پاک سے نکل کر پردہ شہود پر جلوہ گر ہو گئی ہے۔ انسان اس کا شکر ابد الابد تک ادا کرتا رہے تب بھی ادا نہیں ہو سکتا صرف اسی نعمت کو دیکھ کر اللہ کی قسبی عنایتوں پر حیرت ہوتی ہے، افسوس ہم اس نعمت کی قدر نہیں جانتے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تھا، عرض کیا آپ کس عمل سے زیادہ خوش ہوتے ہیں فرمایا "قرآن پڑھنے سے"۔ عرض کیا "خواہ کوئی مطلب بھی نہ سمجھتا ہو؟" ارشاد ہوا "سمجھنا نہ سمجھے"۔ (آپ نے سوال کیا تھا کونسی عبادت سب سے افضل ہے؟

ارشاد ہوا "قرآن")

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز ظل کے اندر ظاہر ہوتی ہے

لیکن قرآن بغیر ظل (پردہ) ظاہر ہوا ہے، یہاں حجاب نہیں بے پردہ ہی جلوہ گری ہو رہی ہے، یاد رکھئے کہ اللہ کی ذات اور صفات کو ”قدیم“ کہتے ہیں۔ یعنی غیر فنا پذیر۔ اور دیگر اشیاء کو (جن میں انسان بھی شامل ہے) ممکن اور محدث یعنی فنا پذیر کہتے ہیں۔ چونکہ قرآن اللہ کا کلام ہے اس لئے بڑے بڑے علمائے محدثین کا خیال تھا کہ قرآن قدیم ہے۔ کلام خدا کی صفت ہے جو ”ممکن“ نہیں۔ اسی عقیدے پر امام احمد بن حنبلؒ کے کوڑے لگانے گئے، کوڑے لگتے ہوئے بھی فرماتے تھے کہ ”قرآن وحدیث سے ثبوت دو کہ یہ فنا پذیر اور مخلوق ہے، یہ مخلوق نہیں، اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی صفت مخلوق نہیں ہو سکتی۔“ اس نکتہ کی خاص ضرورت نہ تھی لیکن قرآن کی اہمیت بتلانے کے لئے لکھ دیا گیا ہے۔

جو علماء قرآن کو مخلوق کہتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز مخلوق ہے چونکہ قرآن خدا کے سوا ہے لہذا مخلوق ہے۔

بہر حال دور حاضر کے علماء نے طے کر دیا ہے کہ قرآن کے الفاظ (الف، بے، تے، ٹے وغیرہ) مخلوق ہیں لیکن حق تعالیٰ کا کلام نفسی مخلوق نہیں جو ان الفاظ کے پردہ میں ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ سبحانہ قرآن میں جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن تم دیکھ نہیں سکتے۔“

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ قرآن عالم بالا یعنی اللہ کے پاس بلکہ ذات کی چیز ہے۔ جو حروف کا لباس پہن کر زمین و عن عالم شہود میں جلوہ گر ہو گئی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ فرماتے ہیں:-

”پس قریب ترین اشیاء بجناب قدس خداوندی جل سلطانہ“

قرآن مجید است کہ گردے از ظلیت بوسے نہ رسیدہ است و

خس و فاشاک تقدیم و تاخیر در چشم مجربان انداختہ بہ اصالت خود در عالم  
ظلال جلوہ گر گشتہ است، لہذا افضل عبادات تلاوت قرآن مجید آمد  
و شفاعت او مقبول ترین شفاعت دیگران گشت چہ شفاعت ملک  
مقرب، چہ شفاعت نبی مرسل۔ نتائج و ثمرات کہ بر تلاوت قرآن مجید  
مترتب می شود، چہ تفصیل آں تو اند نمود: (مکتوبات جلد سوم ص ۱۸۲)

ترجمہ:۔ سب سے قریب شے جو اللہ سبحانہ سے ہے وہ قرآن مجید ہے کہ  
جس کو ظلت (پردہ) کی گرد بھی نہیں لگی، جن لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے  
ہیں وہ قرآن کی تقدیم و تاخیر میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ قرآن کلام اللہ ہے عالم ظلال  
میں اصل حالت میں من و عن جلوہ گر ہوا ہے۔ لہذا سب سے افضل عبادت قرآن  
پاک کی تلاوت ہے۔ اس کی شفاعت قیامت میں مقبول ترین ہے خواہ مقرب  
فرشتہ اور نبی ہی کیوں نہ ہو، تلاوت قرآن پر جو نتائج و ثمرات مترتب ہوتے  
ہیں ہم اس کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

قرآن کا دنیا میں بھیج دینا ایسا ہے جیسے اللہ سبحانہ جنت کا کوئی ٹکڑا یا عرش  
کا کوئی حصہ دنیا میں بھیج دیں۔ اکثر عیسائی علماء نے تو اپنی تصنیفات میں صاف لکھ  
دیا ہے کہ مسلمان قرآن پر قہنا بھی تاز کریں کم ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء سے کسی بزرگ نے پوچھا تھا کہ ذکر افضل ہے یا  
قرآن کی تلاوت؟ انھوں نے جواب دیا "ذکر اپنے مطلب کو جلد پہنچ جاتا ہے  
لیکن اس کو زوال کا خوف ہے اور کلام الہی کی تلاوت کرنے والے کا مطلب دیر میں  
حاصل ہوتا ہے لیکن حصول کے بعد اس کو زوال کا خوف نہیں"۔

اس موقع پر ہم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا قول ان کی تفسیر "فتح العزیز" سے

نقل کرتے ہیں۔ اصل عبارت فارسی میں ہے۔ فارسی لکھنا اور پھر ترجمہ کرنا بہت جگہ گھیرے گا لہذا ہم صرف ترجمہ درج کرتے ہیں۔

وَرَقِلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا ۝ کی تفسیر میں فرماتے ہیں :-

”کم سے کم قرآن کی تلاوت میں تدبیر کا مرتبہ یہ ہے کہ ہر خطاب اور ہر قصہ میں اپنے تئیں مخاطب جانے۔ اور اعلیٰ مرتبہ تدبیر یہ ہے کہ متکلم (بولنے والا یعنی اللہ سبحانہ) کو اور اس کی صفات و افعال کو اس کلام میں شاہد کرے۔ اور تدبیر کا متوسط مرتبہ یہ ہے کہ اس کلام کو حضرت جل شانہ سے بلا واسطہ سنے۔ اب اس جگہ پر جاننا چاہیے کہ سلوک الی اللہ، اس کی حضوری اپنے نزدیک طلب کرنے کو کہتے ہیں، لیکن چونکہ حق تعالیٰ جسمیت سے اور جسمیت کے لوازمات سے پاک ہے تو اس کی حضوری ان تین طریقوں میں سے ایک سے ہو سکتی ہے۔ (۱) پہلا طریقہ ”تصور“ ہے جس کو شرع کی اصطلاح میں ”تفکر“ کہتے ہیں اور اہل سلوک کی اصطلاح میں اس کو ”مراقبہ اور نگرانی“ بھی بولتے ہیں۔

(۲) دوسرا طریقہ ذکر ہے۔ (۳) تیسرا طریقہ تلاوت کلام اللہ ہے؛ چونکہ پہلا طریقہ حقیقت میں ذکر اور یاد قلبی ہے اس لئے کبھی ذکر کو اس طریق میں شامل کر دیتے ہیں اور اس کی حضوری کی طلب کے طریقوں کو دو ہی امر میں منحصر جانتے ہیں یعنی ذکر اور تلاوت میں، لیکن ذکر قلبی اور لسانی دونوں کو شامل ہے۔ سو جو لفظ اس ذات پاک پر بلا واسطہ یا بلا واسطہ دلالت کریگا وہی مدد کے اس ذات پاک کی طرف التفات کا سبب پڑے گا اور جب وہ ذات پاک ملتفت الیہ ہوئی تو گویا موجود (حاضر) ہوئی

اس طرح کے استحضار کا دوام حاصل ہوتا ہے تو ہم نشینی کا حکم پیدا کرتا ہے اور اس ذات پاک کی صفتیں بشریت کی صفتوں پر غالب ہو جاتی ہیں اور خالق کے افعال بندہ کے افعال پر حاکم ہو جاتے ہیں جس طرح حدیث قدسی میں ہے کہ "میرا بندہ نفلیں پڑھ کر مجھ سے قربت حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے، اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے" یعنی جب بندہ کثرتِ عبادت سے خدا کا مقبول ہوا تو حق تعالیٰ اس کے اعضاء کا محافظ ہو جاتا ہے، اس کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں سب خدا کی مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ تقرب کا طریقہ خاص اس ذات پاک کا ہے اگر کوئی چاہے کہ اس طریقہ سے مخلوق سے تقرب حاصل کرے تو یہ ممکن نہیں کیونکہ اس قسم کے تقرب میں دو چیز کا پایا جانا ضروری ہے (۱) ایک تو یہ کہ اس کا علم محیط ہو ذاکروں کے قلبی اورسانی اذکار کو، خواہ ذاکرین مختلف زمانوں اور مکاؤں میں ہوں اس کا علم محیط ہو یعنی ہر ذاکر کے قلبی اورسانی ذکر کو جانتا ہو۔ (۲) دوسری چیز یہ ہے کہ ذاکر کے مدد کے میں در آنے، اس کو پُر کرنے اور اس کی صفت کا حکم پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہو جس کو شرع (قرآن) میں دَنُو، تَدْنٰی، نزول اور قرب کہتے ہیں۔ سو یہ دونوں صفتیں اسی ذات پاک کا خاصہ ہیں، کسی مخلوق میں یہ بات نہیں پائی جاتی، ہاں بعض کافر اپنے معبودوں میں پہلی صفت ثابت کرتے ہیں اور

اہل اسلام میں بھی بعض پیر پرست اپنے پیروں کے حق میں ایسا ہی  
اعتقاد رکھتے ہیں، مگر ان کا یہ دعویٰ بے دلیل ہے حقیقت میں یہ لوگ  
بڑے دھوکہ میں کھنٹے ہوئے ہیں اور بڑے شبہ میں گرفتار ہیں،  
(تفسیر فتح العزیز ص ۱۶۷)

پہچر مانتے ہیں :-

”حق تعالیٰ ہاتھ پاؤں سے پاک ہے، حدیث میں جو مثال پیش  
کی گئی ہے (کہ میں اس کی آنکھ پوجاتا ہوں وغیرہ) یہ آدمیوں کے سمجھانے  
کو ہے تاکہ اس کی قربت کے معنی سمجھ سکیں، پس حق تعالیٰ کی ذات پاک  
کا خاصہ ہے کہ اپنے یاد کرنے والے کی طرف خود نزول فرماتا ہے، اس  
کے نزدیک ہوتا ہے، اس کے مُدرکہ کو پُر کرتا ہے، اس کے باطنی  
لطیفوں پر غالب ہوتا ہے اور جو روح کو نسبت بدن کے ساتھ ہے وہی  
نسبت اس تہی کو روح کے ساتھ ہوتی ہے اور جتنی بھی مخلوقات ہیں  
اگرچہ روحانیات ہوں، اول تو علم محیط نہیں رکھتے کہ ہر ذاکر کے ذکر پر مطلع  
ہوں، دوسرے ذاکر کی روح پر استیلا دائمی نہیں کر سکتے یعنی ہمیشہ  
اس کے حال سے واقف نہیں رہ سکتے، سو کلام الہی کی تلاوت اس  
واسطے اس کے قرب اور نزدیکی کا سبب بنتی ہے کہ اس کلام کے الفاظ  
اس کے معنی پر دلالت کرتے ہیں اور وہ معانی حق تعالیٰ کے علم میں ایک  
مدت دراز تک کلام نفسی کا خلعت پہن کر اور اس کی صفات ذاتی کی  
ایک صفت بن کر رہے ہیں۔ لہذا قرآن کے الفاظ، حق سبحانہ کی صفات  
ذاتیہ کو تلاوت کرنے کے مُدرکہ کے قریب کر دیتے ہیں، اس آمیزش



اور اتحاد کے سبب سے وہ صفتِ ذاتیہ ایک طرح سے پڑھنے والے  
 کی صفت ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا علم محیط ہے  
 وہ دَلْوۃ تَدَّتْی اور قرب کی قدرت بھی رکھتا ہے، لہذا وہ قادر و مقدر  
 جو کچھ ذاکرین کے حق میں اپنی عنایت اور مہربانی فرماتا ہے تو تلاوت  
 قرآن کرنے والے پر بہ طریقِ اولیٰ عنایت و کرم فرمائے گا۔  
 (تفسیر فتح العزیز ص ۱۶۹)

ہم نے یہ اقتباس حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر سے پیش کیا ہے چونکہ کافی  
 اقداریت رکھتا ہے اس لئے تفصیل کے ساتھ نقل کر دیا گیا ہے، ان الفاظ میں جو شش  
 ہے وہ ہمارے اپنے الفاظ میں نہیں ہو سکتی تھی نہ اتنا یقین بڑھ سکتا تھا جتنا کہ  
 شاہ صاحب کے الفاظ سے بڑھے گا۔ جو غیر مسلم قرآن کے متعلق کوئی رائے قائم کرتے  
 ہیں بلکہ جو مسلمان سطحی طور پر قرآن کو دیکھتے ہیں وہ قرآن کو کیا سمجھیں گے۔ قرآن کو  
 سمجھنے اور اس کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے کم از کم اتنی گہری نظر تو ہونی ہی چاہیے۔  
 امام غزالیؒ کی رائے ہے قرآن میں جو آیا ہے کہ ”اگر ہم قرآن کو پہاڑ پر بھی  
 نازل کرتے تو وہ بھی لرز جاتا بلکہ انہوں نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اس سے قرآن  
 کی حقیقت مراد ہے یعنی اگر قرآن کی حقیقت پہاڑ پر بھی نازل ہو جائے تو رانی کافی  
 ہو جائے، لیکن انسان کا دل اللہ نے تکوینی طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ اس کو  
 اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے یہ اس کی صناعتی کمال ہے۔

در اصل اللہ سبحانہ نے ساری کائنات مکمل پیدا کی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے  
 ہیں کہ خالق نے کائنات مکمل پیدا کی ہے اور کامل کی چیز کامل ہی ہوا کرتی ہے۔ اگر  
 کائنات میں کوئی کسر ہوتی تو ذرہ سے ہو سکتی تھی، اول تو (نعوذ باللہ) خالق اس

کو مکمل نہیں کر سکتا تھا، یا کر سکتا تو سبجھل کی وجہ سے کمی چھوڑی، یہ دونوں احتمالات حق سبحانہ کے متعلق محال ہیں۔ کیونکہ وہ قادر مطلق ہیں۔ سبجھل تو اس وقت ہونے لگا کہ ان کی ذات کامل نہ ہو۔ وہ فیاض مطلق ہیں۔ انسان اپنی خلقت پر غور کرے کیا اس میں کوئی کسر یا کمی رہ گئی ہے؟ فرض کیا کوئی یہ اعتراض کرے کہ انسان بیمار کیوں ہوتا ہے؟ یا کیوں مر جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان بیمار نہ ہوا کرتا تو دواؤں کے خواص، اثرات، کوئی تریاق، کوئی زہر ہے یہ کس طرح معلوم ہوتے؟ پھر حکماء اور ڈاکٹروں کی استعداد، دانائی اور فن کس طرح آشکارا ہوتے۔ ارسطو، افلاطون، بقراط وغیرہ کا نام کون جانتا؟ انسان صحت کی قدر اسی وقت کرتا ہے جب کہ بیماری بھی ہو، مرنے کا بھی نعمت ہے، اگر مرنے نہ ہوتا انسان دنیا میں عالم بالا (جنت) کی لیاقت پیدا کر کے کس طرح جائے۔ امام عزالیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ انسان کو دنیا میں اس لئے لائے ہیں تاکہ یہاں رہ کر جنت کی لیاقت پیدا کرے۔ (کیسے سعادتمند)

غالب نے اسی نکتہ کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔  
 ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا! نہ ہو مرنے تو جینے کا مزا کیا  
 یعنی دنیا میں جینے کا مزا تو حقیقت میں مرنے کے بعد ہی آئے گا۔ دوسرے مرنے  
 میں یہ حکمت ہے کہ دوسروں کے لئے جگہ خالی ہوتی رہتی ہے۔ غرض دنیا کے سارے  
 واقعات ساز کے پر دے ہیں مگر جس کے پاس دیدہ بینا ہی نہ ہو اس کو ساری  
 کائنات بازیچہ اطفال ہی نظر آئے گی۔ غالب نے اپنے اوپر طنز کر کے گویا دل کے  
 اندھوں پر طنز کیا ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔

اگر یہ طنز نہ ہوتا تو پھر وہ یہ شعر نہ کہتے  
 قطرہ میں رطلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل  
 کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا  
 انسان اگر کسی چیز سے سب سے زیادہ قریب ہے تو اپنے وجود سے ہے خالق  
 نے کمال یہ کیا ہے کہ انسان کو ساری کائنات کا خلاصہ بنایا ہے اسی لئے کامل صوفیا  
 نے انسان کو "عالم صغیر" کہا ہے، یعنی ساری کائنات کا "عطر" نکال کر انسان تیار  
 کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں ہم اس نکتہ پر کچھ روشنی ڈال چکے ہیں یہاں  
 ہم اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان جب خود کو کبھی نہیں سمجھے گا تو  
 اس سے زیادہ احمق کون ہو سکتا ہے۔ انسان رُوح اور جسم سے مرکب ہے،  
 پھر رُوح اور نفس کا جوڑا ایسا رکھا ہے جیسے شوہر اور بیوی کا۔ رُوح یاد میں بعض  
 احساسات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو زبان بیان کرنے سے قاصر رہتی ہے جیسا کہ  
 کسی شاعر نے کہا ہے ع

زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

رُوح اور نفس کی محبت کے متعلق حضرت مجددؒ کے الفاظ یہ ہیں "ظلمت (اندھیرے)  
 کو نور سے محبت ہوگئی ہے، نفس اندھیرا ہے اور رُوح نور ہے۔ روح لامکانی ہے  
 اور نفس مکانی ہے، لامکانی چیز کو مکانی کے ساتھ جوڑ دینا خالق کی صنّاعی ہے جو  
 قابل غور اور انتہائی حیرت انگیز ہے"

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ہی حیرت انگیز ہے لیکن چونکہ ہوش سنبھالنے  
 کے بعد انسان ساہا سال دیکھتا ہے اس لئے حیرت ختم ہو جاتی ہے لوگ دوسری  
 مرتبہ زندہ ہونے (حشر و نشر) پر تعجب کرتے ہیں لیکن پہلی مرتبہ عالم وجود میں آنا  
 اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں هُوَ الَّذِي

خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۝ وَهِيَ تَوَازَاتُ پاك ہے جس نے تم کو اول مرتبہ پیدا کیا جبکہ تمہارا نام لیوا بھی کوئی نہ تھا، تو دوسری مرتبہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، انسان کو صرف گوشت پوست اور ہڈیوں کا مجموعہ بنا کر، ظاہری اور باطنی حواس و سیر اس قابل بنایا کہ وہ کسب سے اخلاق پیدا کرے۔ اگر آدمی میں اخلاق نہ ہوں تو حیوان ناطق سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں، اس کو حقیقی معنوں میں "انسان" نہیں کہا جاسکتا، انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ بندہ بنے۔ "غالب نے خوب کہا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا اس کتاب میں متعدد مقامات پر آپ نے شیخ محی الدین ابن العربیؒ کے ایسے اقوال پڑھے (خصوصاً وحدة الوجود کے متعلق) جو زیادہ تر مسکریہ ہیں یعنی وہ شیخ کا حال ہے، مگر شیخ جب "صحو" (ہشیاری) کی حالت میں ہوتے تھے تو ان کا رنگ کچھ اور ہوتا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے "الغزالی" میں لکھا ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربیؒ، امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء العلوم الدین" کو کعبہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ "صحو" کی حالت میں انہوں نے کچھ وصیتیں کی ہیں وہ بہت انمول ہیں بقول شخصے

ع۔ فلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید۔

یعنی فلندر جو کچھ بھی کہتا ہے دیکھ کر کہتا ہے، لہذا ہم ان وصیتوں کو یہاں لکھتے ہیں جو تصوف کا گویا نچوڑ ہیں :-

(۱)۔ بندے سے جب کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس وقت تک اس جگہ سے نہ جائے جب تک وہاں کوئی نیکی نہ کر لے تاکہ حسنات (اچھے کام) سیئات (برائیوں) کو محو کر دیں۔

(۲) - خداوند ذوالجلال کے ساتھ نیک گمان (حسن ظن) رکھنا چاہیے کیا معلوم کہ یہی آخری سانس ہو۔

(۳) - اللہ تعالیٰ کا ذکر ستر اور چہر "ہر حالت میں کرنا چاہیے کیونکہ وہ بھی یاد کرتا ہے فَادْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا)

(۴) - کلمہ لا الہ الا اللہ کو بار بار کہنا چاہیے، یہ نامہ اعمال میں سب سے بھاری ہے اس کے ذکر کو لازم پکڑو۔

(۵) - جو یہ کلمہ کہے اس سے محبت یہ رکھنی چاہیے۔

(۶) - فرائض الہی کو ترک نہ کرے اور نوافل کی کثرت کرے تاکہ جو کچھ کمی فرائض میں رہ گئی ہے اس کی تلافی ہو جائے۔

(۷) - بات اور قول کی حفاظت کرنی چاہیے کیونکہ قول بھی عمل ہی ہے، یہودہ بات نہ کرنی چاہیے، خواہ اس کا اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو، قلت کلام و کثرت سماع۔

(۸) - جاندار کی تصویر ہرگز نہ کھینچنی چاہیے اور گھر میں بھی نہ رکھنی چاہیے۔

(۹) - بیمار کی تیمارداری ضرور کرنی چاہیے کہ خداوند کریم اس سے قریب ہوتا ہے۔

(۱۰) - اپنے اوپر لوگوں کے حقوق نہ رکھنے چاہئیں۔ ظلم و ستم نہ کرنا چاہیے۔ قیامت کے لئے کسی کے بوجھ کو اپنے اوپر نہ رکھنا چاہیے۔

(۱۱) - کسی عالم کے موافق علم، عمل نہ کرنے سے دھوکہ میں نہ آ۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک اس کا پایہ بہت بلند ہے اور حق سبحانہ کے پاس نیت اور عمل کی روح موجود ہے

(۱۲) - جو کچھ خداوند تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس کا شکر بار بار کرنا چاہیے، کیونکہ شکر نعمتوں کی زیادتی کا سبب ہے اور کفران نعمت نہ کرنا چاہیے۔

(۱۳) - خداوند کریم کے ساتھ شرکِ جلی و خفی نہ کرنا چاہیے۔ شرکِ جلی تو ظاہر ہی ہے

شُرکِ خفی کہتے ہیں اسبابِ دنیوی پر اعتماد کرنے کو۔ اسبابِ دنیوی بھی نادرا مطلق کے اختیار میں ہیں، ہم سعی کر سکتے ہیں مگر اسبابِ پرہیزگار توکل اور اعتماد نہ کرنا چاہیے اور اطمینان قلبی نہ کرنا چاہیے۔

(۱۲)۔ اپنے متعلق بڑے ہونے کا خیال ہرگز نہیں آنا چاہیے، اگر انجامِ پامی ہو حق شہود ہو اور عالمِ نظر سے مفقود ہو۔

(۱۵) حق اور باطل دونوں پر مناظرہ نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کا ضرر نفع سے زیادہ، (۱۶)۔ ہر حال میں حُسنِ خلق اختیار کرنا چاہیے۔

(۱۷)۔ ہجرت دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف اگر موقع ہو کرنی چاہیے۔

(۱۸)۔ ہر حال اور حرکات و سکنات میں علم کا استعمال کرنا چاہیے۔

(۱۹) لوگوں کے کام آنا چاہیے، افتائے سلام، اطعامِ طعام، سعی و رخصائے حوائج۔

(۲۰) مصیبت اور غم میں استرجاع کرنا چاہیے (یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ

کہنا) کیونکہ اس سے بڑی مصیبت بھی پڑ سکتی تھی اور ”اِنَّا لِلّٰہِ“ کہنے سے اجر زیادہ ہوگا۔

(۲۱)۔ تلاوتِ قرآن کو لازم سمجھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کا کلام ہے۔

(۲۲)۔ عالموں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے کہ ”لَا یَشُقُّ اَجَلِیْسَرْمَدٍ“ (عالموں کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہو سکتا۔ حدیث)

(۲۳)۔ آدمیوں کے درمیان حق فیصلہ کرنا چاہیے۔

(۲۴)۔ دعا اکثر سجدہ میں کرنی چاہیے کیونکہ بندہ خدا کے نہایت قریب ہونا

ہے۔ حدیث ہے اَقْرَبُ مَا یَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّہِ وَهُوَ سَاجِدٌ

یعنی بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب حالتِ سجدہ میں ہوتا ہے۔

(۲۵) حرام سے پرہیز کرو۔

(۲۶) - اللہ کے ساتھ عہد اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں) اُستوا رکھنا چاہیے۔

(۲۷) - صدقہ مالی و زبانی (ذکر) کرنا چاہیے۔

(۲۸) - کسی اہل قبلہ کو کافر مت کہو۔

(۲۹) - بدوں میں سے نہ ہونا چاہیے کہ لوگ تم سے پرہیز کرنے لگیں۔

(۳۰) - اگر کسی کو نصیحت کرو تو یہ دیکھو کہ اول تم خود اس پر عمل کرنے والے ہو۔

(۳۱) - اگر تم چاہو کہ تمہاری مغفرت ہو تو اپنے کو گناہوں سے بچانے کی التجا

جناب باری میں کرو۔ تم سے ایسے کام سرزد ہونے چاہئیں جو قبر میں تمہارے

مونس و مخوار ہوں۔ دنیا فانی ہے اس لئے صرف زاو راہ لینا چاہیے، اس

کی دلفریبیوں میں مت ہو کر اس میں مہمک اور آخرت سے غافل نہ ہونا

چاہیے کہ تم سے پہلے بھی محفلیں گرم ہوئیں اور تمہارے بعد بھی ہوں گی مگر دنیا نے

کسی کے ساتھ وفانہ کی سہ

لگاں مبرکہ تو چوں بگذری جہاں بہ گذشت ہزار شمع بہ کشتند و انجمن باقی ست

(ریاض المتراض از نواب صدیق خاں)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات کی جلد اول کے مکتوب ۳۶ میں لکھتے ہیں

» شریعت کے نین جزو ہیں۔ علم، عمل، اخلاص، طریقت و حقیقت

کے صوفیاء اس میں ممتاز ہوئے ہیں، یہ دونوں ہی شریعت کی خادم

ہیں۔ جب کوئی شخص شریعت کے اتباع میں کامل ہو گیا تو سمجھ لو

کہ اس کو دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں حاصل ہو گئیں۔ شریعت

میں کوئی مقصد ایسا باقی نہیں رہا کہ شریعت کے سوا کسی اور بات کی ضرورت پڑے۔ شریعت کے راستے پر چلتے ہوئے صوفیاء کو جو حالات (و مشاہدات) پیش آتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہیں۔ طریقت اور حقیقت کی جو منزلیں ہیں ان کا مقصد اخلاص حاصل کرنا ہے۔ جو مقام رضا کے لئے ضروری ہے۔ جو کوتاہ اندیش ہیں وہ مشاہدات اور تجلیات کو مقاصد و مطالب میں شمار کرتے ہیں۔ یہ فقیر (خود حضرت مجددؑ) دس سال تک اس مقصد کی تلاش میں رہا۔ خدا کا شکر ہے اتنی مدت کے بعد شریعت کی حقیقت حاصل ہوئی۔

امام المسلمین امام اعظم کوئیؒ (امام ابو حنیفہ) رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے سُبْحَانَكَ مَا عَبَدُكَ فَاقْ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَ لَكِنْ عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (تو پاک ہے ہم نے تیری عبادت ویسی نہیں کی جیسا کہ اس عبادت کا حق ہے لیکن تجھ کو ہم نے پہچانا جیسا کہ پہچاننے کا حق ہے)۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت ویسی نہیں کر سکتا جیسا کہ اس کی عبادت کا حق ہے لیکن معرفت کی حد یہ ہے کہ ذات حق سبحانہ کو اس کی بے چوٹی و بے چگونگی کے ساتھ پہچانے۔

میں کہتا ہوں (یعنی حضرت مجددؑ فرماتے ہیں) "امام اعظمؒ نے اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا کہ مبتدی کو صرف علم حاصل ہونا ہے اور منتہی کو معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ دولت ثانی کو حاصل ہوتی ہے

جیسا کہ مولانا رومؒ نے فرمایا ہے

بیچ کس راتانہ گرد و اوفنا نیست رہ در بارگاہ کبریا۔



یعنی جب تک کوئی شخص فنا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ بارگاہ کبریائی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دراصل تصوف کا مقصد ہی ایمان کا دل میں رچ جانا ہے اس سے پہلے حضرت مجددؒ اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

طریق صوفیاء کا مقصد یہ نہیں کہ شریعت کے علاوہ کوئی اور نئی بات حاصل کریں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ استدلالی ایمان کشفی ہو جائے اور قلب مطمئن ہو جائے۔ اس سلسلہ میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اچھا نکتہ بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں :-

”انسان سے مشاہدہ اور کشف مقصود نہیں ہے (محمود ہے) بلکہ اعمال مقصود ہیں۔ ورنہ دنیا میں آنے سے پہلے حضور واکم میسر تھا۔ دنیا میں اعمال اس لئے کئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر اجر متعین ہو۔“

مولانا نے یہ بھی فرمایا ہے :-

”حق تعالیٰ کسی کو بسط (مسرت) عنایت کرتے ہیں، کسی کو قبض (رنج و غم) جو اس کے حال کے مناسب ہوتا ہے۔ انسان کو رضا و تسلیم کی خواہ اختیار کرنا چاہیے، یوں نہ کہنا چاہیے کہ فلاں حالت پر ہوتا تو بہتر تھا۔ جتنا تعلق انسان کو غیر اللہ سے ہوگا اتنا ہی اس کے دنیوی فعل کا اثر قلب پر زیادہ ہوگا، اگر اللہ سے زیادہ تعلق ہوگا تو دنیوی کاموں کی تاریکی کا اثر دل پر بہت کم ہوگا۔ تقویت خیال میں بدن انسانی کو بہت دخل ہے کیونکہ طاقت بدنی سے نفسانی قوت زیادہ ہوتی ہے اور نفسانی قوت سے خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔“

حضرت مجددؒ اکتانائیؒ کا تصور یہ ہے کہ عقل فی حد ذاتہ احکام الہی کے سمجھنے میں

نا تمام ہے لیکن حصول تصفیہ و تزکیہ یعنی دل صاف کرنے کے بعد عقل کو حق سبحانہ و تعالیٰ سے مناسبت و اتصال حاصل ہوتا ہے، ان کے اصل الفاظ یہ ہیں :-  
 ”چرا نتواند کہ بعد از حصول تصفیہ و تزکیہ عقل را مناسبت و اتصالے  
 غیر متکلیف بمرتبہ و جوب تعالیٰ و تقدس پیدا شود“

اب حضرت مجددؑ نے سوال کیا ہے کہ صفائی قلب کے بعد حق سبحانہ سے کیوں بے کیفیت قرب حاصل نہ ہو؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے :-

”اگرچہ عقل کو مناسبت اور اتصال پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ انسان کی روح اس جسم میں قید ہے، حرص، غضب، شہوت بھی ساتھ ہیں لہذا اسہو و نسیان بھی انسان کے ساتھ لازم ہیں، اس سے منفک نہیں ہو سکتے، خطا اور غلطی اس سے جدا نہیں ہو سکتیں لہذا محض عقل پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا بخلاف فرشتہ کہ وہ ان باتوں سے پاک ہے۔ البتہ عقل کو نبوت سے جو فیض حاصل ہوگا اس کی وجہ سے وہ صواب کے قریب ہوگی“

مولانا اصغر علی رومیؒ نے فرمایا ہے :-

”لفظ عقل کا استعمال عموماً دو طرح پر آیا کرتا ہے، اول عقل مطبوع، یہ نور فطرت ہے جو خلقت انسان کے ساتھ ہی خداوند کریم کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے یہ نور فطرت مختلف لوگوں میں ایک ہی درجہ پر موجود نہیں ہوتا۔

دوسری عقل مسموع۔ یعنی وہ نور علم جو انسان بذریعہ تعلیم و تعلم

حاصل کرتا ہے اور جو تجربہ اور مشاہدہ سے زیادہ کیا جاسکتا ہے“

یونانی حکماء کی ایک اصطلاح ہے اس کو THEOSOPHY کہتے ہیں۔ افلاطون اور دیگر چند حکماء کا عقیدہ ہے کہ "ہر شخص خدا کی معرفت روحانی وجدان سے حاصل کر سکتا ہے" ہمارے نزدیک یہ وہی عقل مطبوع یا نور فطرت ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسی لئے محققین اسلام کا خیال ہے کہ جس دور جگہ یا جزیرہ میں اسلام نہ پہنچا ہو اور وہاں کے لوگ صرف نور فطرت سے اپنے پروردگار کا یقین رکھتے ہوں ان کو حق سبحانہ اپنے کرم سے بخش دیگا۔ امام غزالی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید بحث "ایمان اور کفر" کے زیر عنوان ملے گی۔

امام فخر الدین رازی "تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:-

"عالم تین قسم کے ہوتے ہیں، عالم باللہ، عالم بامر اللہ، عالم باللہ و بامر اللہ" عالم بامر اللہ کی علامت امام صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اس کو اللہ کے احکام کا علم ہو، اللہ کا علم نہ ہو (یہ عالم ظاہر کیلانا ہے) اللہ کا زبان سے ذکر کرے دل سے نہ کرے، خلق سے نہ ڈرے، پروردگار سے نہ ڈرے۔ لوگوں سے شرم و حیا کرے، اللہ سے شرم و حیا نہ کرے۔"

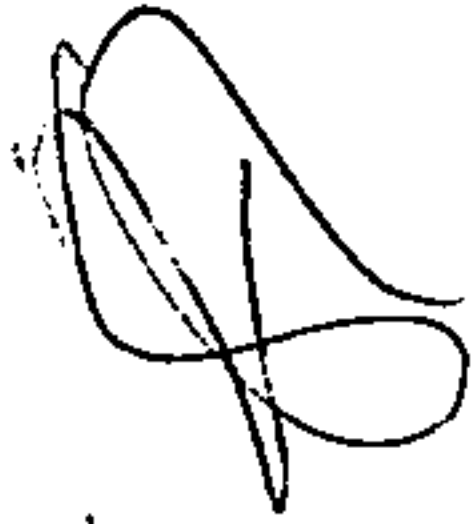
عالم باللہ کی علامت یہ بیان کی ہے کہ اس کو اللہ کا علم ہے اللہ کے احکام کا علم نہیں ہے، اللہ کا دل سے ذکر کرے زبان سے نہ کرے، ریا کا خوف ہو گناہ کا خوف نہ ہو۔ دل میں جو خطرات آتے ہیں ان سے حیا ہو ظاہر کی حیا نہ ہو۔"

عالم باللہ و بامر اللہ کی علامت یہ ہے کہ اس کو اللہ اور اس کے احکام، دونوں کا علم ہو۔ یہ عالم گویا عالم شہادت اور

عالم غیب کی سرحد پر بیٹھا ہوا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں :-

”جیوانات کے افعال سے ان کی طبیعتوں پر اثر راسخ نہیں  
ہوا کرتا مگر انسان جو فعل کرتا ہے تو فراغ کے بعد وہ افعال تو  
نابود ہو جاتے ہیں لیکن ان کی رو میں جدا ہو کر نفس میں بیٹھ جاتی  
ہیں۔ اس سے ہی نفس میں ایک نور یا تاریکی باقی رہ جاتی ہے اس  
سے بلند حالات اور مقامات پیش آتے ہیں جیسے اللہ کی محبت اور  
خدا پر توکل وغیرہ۔“



# محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

غالب ثنائے خواجہ بہ بیزواں گذاشتیم

کا ذات پاک مرتبہ دان محمد است

رسول پاک کی تعریف میں غالب کا یہ حسین شعر ہے۔ جامی نے بھی کہا ہے :-

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یعنی اللہ کے بعد آپ ہی مرتبہ میں ہر جن و بشر اور فرشتے سے بڑے ہیں۔ چونکہ حضور کا ذکر ہے لہذا کچھ تفصیل سے ہی بیان کر دیا جائے۔ محبوب کا ذکر جتنی مرتبہ بھی کیا جائے اور سنا جائے کم ہے۔ چھٹی صدی عیسوی، تاریخ عالم کا تاریک ترین دور تھا، کفر و الحاد کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، زنا، چوری، ڈکیتی لوگوں کے عام شغل تھے۔ رومنہ الکبریٰ میں مذہب کے نام پر خون کی ارزانی تھی، غلاموں کو جانوروں کی طرح لٹا ابا جاتا تھا، شراب نوشی عام تھی، آتش پرستی بڑے کروفر سے ہو رہی تھی، بت پرستی نہ صرف ساری دنیا میں بلکہ کعبہ میں ہو رہی تھی، عیسائی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے مجسموں کی پرستش کر رہے تھے، عورتوں کو گرجاؤں میں شرمناک سزائیں دی جاتی تھیں، عرب کی حالت اور بھی بدتر تھی، بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا، معمولی معمولی جھگڑوں پر پچاس پچاس برس تک لڑتے تھے، خدائی قانون پر پردے ڈال دئے گئے تھے، ہر علاقہ بلکہ ہر قبیلہ

کا جدِ مذہب اور جدِ اہل بیت تھا۔ کلیسا میں بہت خانے اور صومعے صنم خانے بن گئے تھے، خاص کعبہ شریفہ میں تین سو ساٹھ بیت رکھ دئے گئے تھے۔

ع چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان۔

ازل سے خالق کائنات کو انسان کی طرف توجہ خاص رہا ہے، اس کو بنانے میں پورا کمال دکھایا ہے، اس کی رحمت نے گوارا نہ کیا کہ جس کی جناب میں گستاخی فرشتہ برداشت نہیں کی جاتی وہ حیوان بن جائے۔ چنانچہ غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور ابرِ رحمت کوہِ فاران کی طرف بڑھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء کو دعائے خلیل اور نویدِ سجا پہلوانے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ خزانہ رحمت کا ایک درّہ بتیم عالم شہود میں جلوہ گر ہوا جس کو آگے چل کر زمانے نے محمد الرسول اللہ کے پیارے نام سے پکارا، حضور کے والد عبداللہ آپ کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ ذاتِ پاک اپنا سایہ ڈالنا چاہتی تھی اس لئے باپ کے سائے کی ضرورت نہ تھی۔ رحمتِ تمام نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ حکیم و خیر نے ۱۹۷۱ء میں یعنی پیدائش کے پانچ سال بعد ماں کا سایا بھی اٹھا لیا۔ والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد دارِ اعباد <sup>الطلب</sup> نے پالا پوسا، لیکن ۱۹۷۸ء میں وہ بھی انتقال کر گئے۔ ان کے بعد آپ کے چچا ابوطالب (حضرت علیؑ کے والد) نے آپ کی پرورش کی اور ساری عمر حضورؐ کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہے۔ آپ بچپن میں کبھی بچوں کے ساتھ نہیں کھیلے، کوئی کھیل تماشا نہیں دیکھا، ایک مرتبہ کوئی تماشا دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے تھے، لیکن نیند آگئی جس کو وہ بچاتے ہیں یوں بچاتے ہیں۔ جوان ہوئے، عقل کامل ہوگئی، چاروں طرف نظر دوڑائی، اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا، لوگوں کو بتوں کی پوجا کرنے دیکھ کر تعجب ہوا، اللہ عزوجل نے فطری طور پر ایمان بخشا تھا، اخلاق میں تو کوئی ثانی نہ تھا، امانت کا یہ

عالم تھا کہ نبوت ملنے سے پہلے امین مشہور ہو گئے تھے۔ مکہ کی ایک دولت مند اور نیک خاتون حضرت خدیجہؓ کا مال فروخت کرنے کے لئے باہر جانے لگے۔ تقریباً پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی جن کی عمر اس وقت چالیس سال کی تھی۔ ۶۲ء میں حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ سے قاسم پیدا ہوئے۔ اسی لئے شروع میں لوگ حضورؐ کو ابوالقاسم کہہ کر پکارتے تھے۔ ان سے چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ، اور حضرت فاطمہؓ۔ حضرتؐ کو ۶ رمضان المبارک مطابق ۶ اگست ۶۱۰ء کو نبوت ملی۔ اور ساری دنیا کو اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لانے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک دن خالق کا حکم پہنچا کہ ساری دنیا تباہی کے وہانے پر کھڑی ہے۔ اُٹھیے۔ آپ کھیل اور اڑھے ہوئے لیٹے تھے اس وقت جبریلؑ بحق سبحانہ کا یہ پیغام لائے۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ائْتِ بِنُورِ رَبِّكَ

اور دنیا کو عذاب الہی سے ڈرا۔ حکم کا ملنا تھا کہ فوراً اُٹھ گئے اور عالم والوں کو توحید کا درس دینا شروع کیا۔ کفار نے ناقابل بیان تکلیفیں پہنچائیں، پتھر کھائے، خون نکلا۔ ابوطالب نے سمجھایا کہ بھتیجے ایسا نہ کرو، میں کہاں تک تمہاری حفاظت کروں گا۔ حضورؐ نے بہادری کے ساتھ فرمایا ”گردن اڑ جائے یا چاند اور سورج کو میسر ہاتھوں میں دیدیا جائے میں تبلیغ سے باز نہیں آؤں گا، ربؐ قدیر نے مجھے اس کام پر مامور کیا ہے“ پھر عرب والوں کو تلقین کی، ایران کے کج کلاہ کو ڈرایا اور رومؓ کی بکری کے بادشاہ کو دعوت دی۔ ابنائے وطن نے مکہ میں رہنا مشکل کر دیا تو ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی۔ یہاں پہنچ کر تبلیغ شروع کی۔ صورت میں کشش تھی اور آواز میں جادو، جس نے دیکھا بندہ بے دام ہوا، جس





الْجُمُعِ وَيُولُونِ الدُّبُرَ يَهْ كُفَّارًا شَرَابًا يَهْ بِمِثْقَلِ حَبِّ كَرْبِ لَبَّابٍ

یہ واقعہ ۳ مارچ ۶۲۲ء کو ہوا۔ اسلام اور کفر کی پہلی جنگ تھی جو اس زمین پر لڑی گئی۔ سب سے پہلے سعد بن ابی وقاص نے تیر بھینکا، یہ پہلا تیر تھا جو خدا کی راہ میں بھینکا گیا تھا۔ کفار کو شکست فاش ہوئی، ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ ان میں ابو جہل بھی تھا۔ اسی روز اسلام کی فتح کا رنگ بتیاد رکھا گیا۔ اس کے بعد فرزند ان توحید نے نصف صدی میں ایران اور روم کے تاجداروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ نصف کرہ ارض پر اسلام کا پرچم لہا دیا، حضور نے بادشاہوں کو خطوط لکھے، "أَسْلِمْتُ لَكُمْ" اسلام لا سلامت رہے گا، یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ایران کے بادشاہ نے خط پڑھ کر بھاڑ دیا۔ آپ کو وحی سے معلوم ہو گیا فرمایا "إِذَا هَلَكَ كِسْرَى، لَا كِسْرَى بَعْدَهُ" یعنی جب ایران کا یہ بادشاہ ہلاک ہو جائے گا اس کے بعد پھر کوئی آتش پرست ایران کا بادشاہ نہیں ہوگا۔ اسی روز رات کے وقت اس کے بیٹے نے بادشاہ کا پیٹ چاک کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد ایران مسلمانوں کے ہاتھوں پر فتح ہو گیا۔ پھر جنگ خندق ہوئی، مدینہ کو کافروں نے گھیر لیا، آپ نے زمین کھودتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر گدال مارا اس سے ایک شعلہ بلند ہوا، آپ نے فرمایا "اللہ اکبر، مجھے ایران و روم کے محل نظر آگے جو مسلمانوں کے ہاتھوں پر فتح ہوں گے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بلا تبادلت اسی طرح ہوا۔

حضور نے کبھی گوشہ نشینی اختیار نہیں کی۔ ساری عمر جدوجہد اور دین اسلام کے کاموں میں گذاری۔ رات کو عبادت کرتے تھے، اللہ کا شکر کرتے تھے اور روتے تھے مگر میدان جنگ میں گھوڑا دوڑا کر چھڑی سے صفوں کو درست کرتے تھے، دونوں

وقت پریٹ بھر کر کبھی نہیں کھایا۔ نرم دل بھی تھے اور شجاع بھی۔ ایک دفعہ گھمان  
 کی جنگ شروع ہوئی تو فرمایا ہذا اِحِیْن حَمِی الْوَطِیْسِ (ہاں اب جنگ کا  
 تنور گرم ہوا ہے)۔ حق و صداقت کا پیکر تھے، روئے انور دیکھ کر اللہ زیاد آنا تھا  
 آپ نے اپنی مہر اس زندگی میں قرآن حکیم پر مکمل طور پر عمل کر کے دکھلا دیا حضرت  
 عائشہؓ فرماتی ہیں آپ <sup>ہوئے</sup> مطلق قرآن تھا، یعنی قرآن علم ہے اور آپ اس کا عملی نمونہ  
 تھے، بہت رحمدل تھے، میدان جنگ میں اپنے ہاتھ سے کسی کافر کو قتل نہیں کیا،  
 صرف ابی بن خلف کو برچھے سے معمولی طور پر زخمی کیا تھا، لیکن وہ چیخنے لگا اور  
 خون کی وجہ سے مر گیا۔ اللہ عزوجل نے جس کام کے لئے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا  
 اس فرض کو خوب انجام دیا۔ حجۃ الوداع (یعنی آخری حج) کے موقع پر لاکھوں آدمیوں  
 کے مجمع میں اونٹ پر سوار ہو کر تقریر کی، شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور  
 پھر لوگوں کی طرف کی اور فرمایا "اَللّٰهُمَّ اَشْهَدُ بِعِنِّیْ اَللّٰهُمَّ اَشْهَدُ بِعِنِّیْ" یعنی یا اللہ گواہ رہنا میں نے  
 مرنے سے پہلے اتنے آدمیوں کو آپ کے دین میں داخل کر دیا ہے، اس کے بعد  
 آپ تقریباً تین ماہ اس دنیا میں رہے، چند روز علیل رہ کر یہ آفتاب رسالت  
 دُنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ  
 حضور کے حق ہونے کی غیروں نے بھی شہادت دی ہے۔ نیولین بونا پارٹ  
 کہتا ہے "محمد کی ذات ایک مرکزِ ثقل تھی، جس کی طرف لوگ کھینچتے چلے آتے  
 تھے، ان کی تعلیمات نے لوگوں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا جنہوں نے چند سال میں  
 اسلام کا غلبہ دنیا میں کر دیا۔ اسلام کے ان پیروں نے دُنیا کو جھوٹے خداؤں  
 سے چھڑایا، بت سرنگوں کر دیئے، حقیقت یہ ہے کہ محمد کی ہستی بہت بڑی ہستی تھی۔"

(بونا پارٹ اور اسلام از شیفلز صفحہ ۱۰۵)

سی۔ ایف۔ انڈریوز رقم طراز ہے :

” دنیا میں ایسے لوگ خال خال ہی ملیں گے جن کی بزرگی و عظمت کی  
روحِ جلیل اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ظاہری اسباب دنیاوی معدوم  
تھے، ایسی برگزیدگی، شرف و جلالت کی دلیل ہمیں محمدؐ میں ملتی ہے۔“  
جال ہی میں جارج برنارڈشا بڑے مشہور فلاسفر گزرے ہیں، انھوں نے اپنے قلب  
کی گہرائی سے کہا ہے :

” اس وقت ساری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے، اب کوئی اس  
کو تباہی سے نہیں بچا سکتا، اگر اس کو بچانا ہے تو محمدؐ جیسی ہستی کہیں  
سے ڈھونڈھ کر لاؤ۔“

جارج برنارڈشا نے اپنی فراست سے وہی بات کہی جو اب سے تقریباً چھ سو سال  
پہلے مولانا عبدالرحمن جامی نے حبِ رسولؐ کے جذبات سے سرشار ہو کر کہی تھی۔

اے بہ سراپردہٴ یثرب بہ خواب

خیبہ کہ شد مشرق و مغرب خراب

( اے مدینہ کی آرام گاہ میں سونے والے، اٹھ اور نکل کر دیکھ کہ دنیا مشرق

سے مغرب تک خراب ہو چکی ہے ) ” دیکھے غالب نے کتنا سچ کہا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گدا شتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دان محمد است

سید احمد رضا

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ لَمْ يَرْحَمْ

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ لَمْ يَرْحَمْ

مَنْ لَمْ يَرْحَمْ لَمْ يَرْحَمْ